ہفت روزہ

الفتح

کراچی



ہر روز اچھی شیو

ٹریٹ بلیڈ۔ ہر روز اچھی شیو ▭ سُتھری شیو ▭ ہر روز دمکتا چہرہ ▭
ٹریٹ بلیڈ میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے بلیڈ میں
ہونی چاہییں ▭ دھار جِلد پر محسوس ہی نہیں ہوتی ▭
ٹریٹ بلیڈ۔ ہفتہ میں سات بار ▭ مہینہ میں تیس دن ▭



روزانہ شیو — ہر بار ٹریٹ بلیڈ سے

بلیڈ کو پونچھئے نہیں دھو کر خشک کر لیجئے

PRESTIGE TRBC.22/5, 71

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۳ ——— شمارہ: ۳۰

یکم - ۸ جون ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی

⊙

مدیر

ارشاد راؤ

⊙

نائب مدیر

وہاب صدیقی

	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
بدل اشتراک	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۵۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۵۰ درم

سعودی عرب: ۵ قرش۔ انگلستان ۱ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ "الفتح"، ۲۰ - ڈی نرسری کمرشل ایریا

پی ای سی ایچ ایس ——— کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون: ۴۱۲۲۷۴

سرورق: بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی

اداریہ

بھٹو کے دوست، بھٹو کے دشمن

ایک اشتہار اخبارات میں چھپا۔ اس میں سرمایہ داروں نے دھمکی دی کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تمام اشتہارات بند کر دیئے جائیں گے۔ اگر انہوں نے طبقاتی شعور پھیلانے کا کام جاری رکھا یہ سزا بعض اخبارات کو بھی ملے گی۔

وزیر اطلاعات نے بیان دیا۔ نشریاتی اداروں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ خیال رکھیں۔

ایک ہدایت اخبارات میں شائع نہیں ہو سکی۔ یہ خفیہ ہدایت ہے اور اس کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وزراء اور دوسرے کارندے طبقاتی شعور نہ پھیلائیں۔

ایک خبر آئی۔ لاہور میں کسن شائن کے مالک محمد اصغر ایم۔ پی۔ اے (پیپلز پارٹی) نے مزدوروں پر فائرنگ کر دی۔ ایک مزدور ہلاک دو زخمی۔

ایک اور خبر آئی۔ فتح ٹیکسٹائل ملز کے چند مالکان کو فائرنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اور پھر کراچی میں زیب تن کے سات سو کے لگ بھگ مزدوروں نے مقامی حکام کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ انہیں تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔

اس بات کا صدر بھٹو کو بخوبی احساس ہے کہ ان کی کامیابی مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور مظلوم عوام کی مرہون منت ہے۔ صدر بھٹو نے انتخابی مہم کے دوران اور اس کے بعد اس طبقے سے اپنی وابستگی کا والہانہ اظہار کیا ہے۔ ان کی ہر تقریر کی ابتداء میرے دوستو، بھائیو، محنت کشو، مزدورو اور طلباء سے ہوتی ہے۔ یہ ان کے دوستوں کا طبقہ ہے۔ طبقاتی شعور کی شمع کو جلا بخشنے میں صدر بھٹو کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جہاں کہیں گئے، انہوں نے ظالموں اور مظلوموں کے درمیان واضح لکیر کھینچی اور عوام کو اپنے قریب لے آئے۔

ہمارے نزدیک صدر بھٹو آج بھی اپنی روش پر قائم ہیں۔ ان کی تقریریں اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ لیکن جب سے پیپلز پارٹی کو جاگیرداروں اور اب سرمایہ داروں نے اپنی توقعات کا مرکز بنایا ہے اس وقت سے پیپلز پارٹی کے اپنے وزراء یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اقتدار میں آنے کے بعد اس جماعت کا طبقاتی کردار سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے وابستہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ وزراء میں زیادہ تر وہ شخصیات ہیں جو جاگیرداروں میں سے ہیں۔ چند ایک نوکر شاہی کے معروف ایجنٹ ہیں۔ انہوں نے عوام میں پارٹی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب حکومت کی تصویر یہ ہے۔ ستانوے نوکر شاہی، تین فی صد پیپلز پارٹی۔ اس تین فی صد میں سے ۹۹ فی صد جاگیردار، ان حالات میں اس طبقے کو کچلا جا رہا ہے جس سے صدر بھٹو اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

عوام اس لئے منہا ہو گئے کہ پارٹی کی تنظیم کرنے والے فائلوں کے چکر میں گم ہو گئے ہیں۔ ایک وزیر کی یہ دلیل غلط اور لغو ہے کہ حکومت میں شامل ہونے والے عہدیدار بھی وہی کام کر رہے ہیں جو وہ پہلے کرتے تھے۔ حکومت کا وزیر سب کے لئے یکساں ہے لیکن پارٹی کا عہدے دار اپنی پارٹی کا وفادار ہو گا۔

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

الفتح کا انقلابی گیت

ترجمہ :- محمود شام

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ

آزادیٔ فلسطین کی عسکری تنظیم الفتح کی سالگرہ کے موقع پر
فلسطینیوں کا انقلابی نغمہ نذرِ قارئین ہے

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم، نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا

العاصفہ کے نام پر کرتے ہیں عہد ہم
العاصفہ، کہ فتح ہے جس کے نصیب میں
ہم تو بیانگ دہل یہی کھائیں گے قسم

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم، نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا

ہر زخم جسم کا ہے اسی عہد کا نقیب
اس عہد سے شگفتہ ہیں اقصائے آسماں
اس عہد سے ہی چمکیں گے اپنے سیہ نصیب

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم، نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا

رک پائیں گے قدم نہ کبھی ہونگے سر ہی خم
سر بھی بلند اور علم بھی بلند ہیں
بڑھتے رہیں گے فتح کے رستے پہ دم بدم

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم، نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا

ہاتھوں میں ہے مشین گن، نظروں میں ہے وطن
جاری ہے اپنا مارچ کہ جب تک نہ جگمگائے
دیوار و در پہ حرّیت کی صبح کی کرن

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم، نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا

اس عہد میں شریک شہیدوں کی روح بھی
ماؤں کی بیٹیوں کی زباں پر یہ عہد ہے
یہ گولیوں کا شور بھی کہتا ہے اب یہی

ہم کو نہیں قبول یہ پُر امن تصفیہ
پلٹیں گے اب قدم نہ جھکے گا ہمارا سر
نعروں سے گونجتی ہے فلسطین کی فضا



صدر بھٹو مسلم ممالک کو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی اجازت دینے جا رہے ہیں

واقفِ حال

صدر بھٹو چودہ ملکوں کے دورہ پر تشریف لے گئے ہیں ان میں نیپال کی دولت سے مالا مال ملکوں کی تعداد زیادہ ہے اور کچھ دوسرے ممالک بھی ہیں۔ چودہ کے چودہ اسلامی ممالک کہلاتے ہیں —— محرومی، پسماندگی اور سیاسی طور پر ڈانواڈول رہنا اسلامی ملکوں کا مقدر بن چکا ہے بھٹو صاحب جس تیزی سے ملکوں کا دورہ نپٹا رہے ہیں اس سے یہ لگتا ہے کہ وقت بہت کم ہے۔ ایک مصیبت آنے والی ہے۔ اس سے پہلے پہلے جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ اتنی جلدی کے دورے میں کیا حاصل ہوتا ہے اور کیا نہیں، اس کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ —— یہ کیا کم ریکارڈ ہے کہ بارہ روز میں چودہ ممالک کا دورہ مکمل ہو جائے۔ پی آئی اے کا جیٹ طیارہ —— ان ممالک میں پہلے لیے پھرے گا —— زیادہ وقت اس طیارے میں گزرے گا اور دورے کا کم وقت ان ممالک کے دارالحکومتوں میں گزرے گا —— ایجنڈا پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے اور مشترکہ اعلامیے بھی تیار شدہ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ چند ایک الفاظ کی ردوبدل ہوتی ہے اور مشترکہ اعلامیہ تیار ہو جاتا ہے اور کہا یہی جاتا ہے کہ دورہ مکمل ہو گیا، تعلقات بڑھ جائیں گے، مختلف مسائل پر افہام و تفہیم ہو گیا۔

گزشتہ دورے میں صدر بھٹو —— مسلم ممالک کو کچھ عرصہ کے لیے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر اب کے وہ انہیں سگنل دینے جا رہے ہیں کہ میں اپنے ملک میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لیے رائے عامہ ہموار کر رہا ہوں۔ اب آپ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا چاہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ گزشتہ دنوں صدر بھٹو نے غیر ملکی اخبارات کو جو انٹرویو دیئے ہیں ان میں انہوں نے بار بار کہا ہے کہ —— "بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے، وہ ایک بڑا مسلم ملک ہے اس بات کو قبول کر لینا چاہیئے کہ وہ ایک حقیقت ہے اس دورے کے بعد اگر مسلم ممالک کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا تانتا بندھ جائے تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں۔ انڈونیشیا کے وزیر خارجہ آدم ملک ایک روز پہلے ہی صدر سے مل کر گئے ہیں۔

۱۳ / جون سے پاک بھارت سرحد بھی کھل جائے گی —— اب تک ہمارا موقف یہی رہا ہے کہ پہلے بنیادی تنازعات حل کیے جائیں پھر تجارتی تعلقات بحال ہوں۔ اب اگر مذاکرات سے پہلے ہی بھارت اور پاکستان کے سفارتی تعلقات بھی بحال ہو جائیں تب بھی اہلِ وطن کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم نے بھٹو صاحب کے دورۂ روس سے واپسی پر لکھ دیا تھا کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا، بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرے گا —— پاکستان نے روس میں بھارت کو تجارت کے لیے فضائی اور زمینی راہداری کی پیش کش کی ہے —— ہمارے یہ نتیجے اب مصدقہ ہو رہے ہیں۔ تجارت کے لیے راستہ کھول دیا گیا ہے —— اب درۂ خیبر سے واہگہ یا حسینی والا تک کی شاہراہ —— نہ صرف بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت کے لیے استعمال ہو گی بلکہ افغانستان کا ضائع ہونے والا پھل بھی ہندوستان پہنچ سکے گا۔ اور روس کے ٹرک بھی بھارت کی ضرورت کا سامان (جس میں اسلحہ بھی ہو سکتا ہے) لے کر اسی شاہراہ سے ہندوستان جایا کریں گے ہم نے اپنے راستے کھول دیئے ہیں —— کیونکہ اب ہماری کوئی قومی شخصیت نہیں رہی ہے۔ ہم اب دوسری قوموں کی گزرگاہ بننے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے، روسی ٹرک جاتے کیا کیا نقوش چھوڑ جائیں گے، بھارتی اپنے ساتھ کیا کچھ لائیں گے بہرحال سرحد کھل گئی ہے۔

یہ تو بیرونی حالات ہیں۔ —— اندرونی حالات یہ ہیں کہ اس وقت اس ملک میں دو سربراہ ہیں۔ ایک جو ملک کا آئینی صدر بھی ہے اور مرکز میں جس کی اکثریت بھی ہے مگر اس کا حکم پنجاب اور سندھ میں چلتا ہے۔ بلوچستان اور سرحد کو اس نے ولی خان کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ ولی خان ان دونوں صوبوں کے بے تاج بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بڑی عقلمندی کی کہ کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا اس لیے وہ بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کو —— جو دراصل مرکز کے ایجنٹ ہوتے ہیں —— پتلیوں کی طرح نچاتے ہیں۔ اسی طرح سرحد اور بلوچستان کی وزارتیں ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ دونوں صوبوں میں ان کی اپنی حکمت عملی چل رہی ہے۔ وہ کبھی کبھی دندناتے ہوئے پنجاب کا رخ بھی کرتے ہیں —— یہ بات ماننی چاہیئے کہ وہ جتنی آزادی سے پنجاب میں تقریریں کر لیتے ہیں اتنی آزادی سے اس ملک کے صدر کو کوئٹہ میں تقریر کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔

اس وقت اس بحث میں پڑنا فضول ہے کہ گورنر —— غیر جانبدار رکھے جائیں تو بات چل سکتی ہے نیپ غیر جانبدار گورنروں کے تقرر پر رضامند ہو گئی تھی۔ مگر پیپلز پارٹی کے اپنے "شہزادوں" کی بحالی کا مسئلہ تھا —— اگر کھر صاحب کو گورنر پنجاب نہ بنایا جاتا تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا —— اب سرحد اور بلوچستان سیاسی طور پر مرکز سے بالکل کٹ چکے ہیں۔ ان میں کوئی سیاسی ہم آہنگی نہیں ہے —— —— خدائی خدمت گار کا فیصلہ ہو لیتا ہے تو مرکز صرف اظہارِ افسوس کرتا ہے اور یہ فیصلہ خود گورنر سرحد نے کیا ہے جو مرکز کا ایجنٹ ہے —— مرکز کا ایجنٹ ایسا فیصلہ کرتا ہے جس پر مرکز اظہارِ افسوس کرتا ہے۔ ہم اس کا الزام صرف اور صرف صدر بھٹو کو

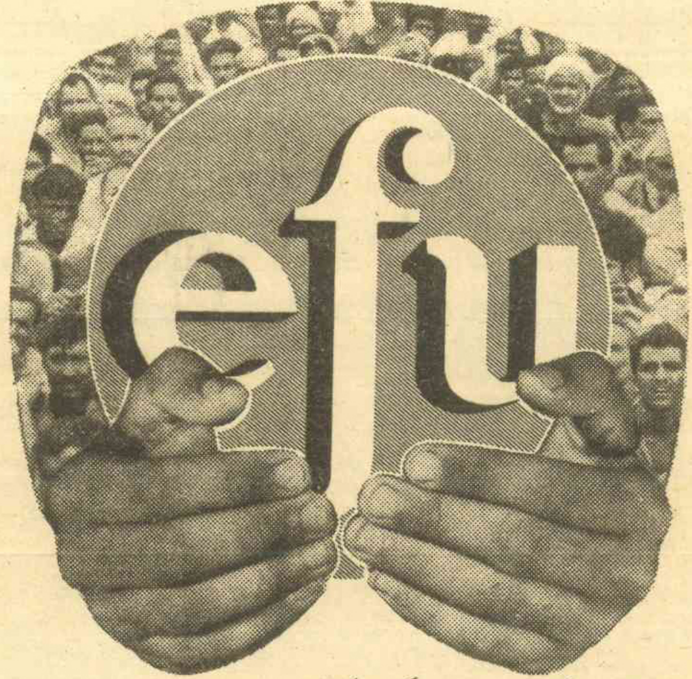
دیتے ہیں جو صدر بننے کے بعد اپنی پارٹی کو بھول گئے ہیں۔ انہوں نے اقتدار کے ایوانوں میں پارٹی کو ریزہ ریزہ کرکے بکھیر دیا ہے۔ سرحد اور بلوچستان جہاں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں تھی وہاں پارٹی مزید کام کرکے اپنے آپ کو مقبول کیا بناتی، سندھ پنجاب، جہاں پارٹی کو اکثریت حاصل ہے، وہاں بھی پارٹی کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔ کیونکہ پارٹی بحیثیتِ سیاسی پارٹی کام نہیں کر رہی ہے۔ صدر بھٹو اس حکومت کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں، جس میں ان کا صرف کچھ فیصد حصہ ہے۔ باقی سب اس نوکرشاہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایک لائل پور کی سیٹ نے پوری مرکزی اور پنجاب کی صوبائی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی کو عوام کا اعتماد اس طرح حاصل نہیں رہا جس طرح ایک ڈیڑھ برس پہلے تھا۔ یہ سیٹ پیپلز پارٹی نے جیت بھی لی تب بھی کہا جائے گا کہ حکومت نے دھاندلی سے الیکشن جیتا ہے، نہ جیتا تو ویسے حیثیت غیر مستحکم ہو جائے گی ——— اگر پیپلز پارٹی نے سرکاری اور پارٹی عہدے الگ الگ رکھے ہوتے تو آج ایسا ماحول دیکھنے میں نہ آتا۔ سرکاری عہدوں والے اپنا اپنا کام کرتے رہتے، پارٹی الیکشن لڑ لیتی۔ اب سندھ اور پنجاب میں کارکنوں، عوام اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ محرومی اور بددلی کا شکار ہو کر دوسری قیادت کی تلاش میں ہیں ولی خان ——— اسی خلا کو محسوس کرتے ہوئے پنجاب اور سندھ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ انہیں پنجاب اور سندھ سے کچھ حاصل نہیں کرنا ہے کیونکہ اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ پختونستان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کابل اور ماسکو ریڈیو اس نغمے کو بلا وجہ تو نہیں الاپ رہے ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں وہ سیاسی بے یقینی اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور مرکزی حکومت کے خلاف عدمِ اعتماد، نفرت اور احتجاج پھیلانا چاہتے ہیں تاکہ کبھی ولی خان اور مرکزی حکومت کے درمیان تصادم ہو تو پنجاب اور سندھ دیوار بن کر مرکز کے پیچھے کھڑے نہ ہو سکیں۔

ولی خان پنجاب میں ایک "جن" کی طرح دندناکر پشاور واپس چلے گئے ہیں۔ اب وہ سندھ کا دورہ کرنے والے ہیں۔ سندھ میں پیپلز پارٹی زیادہ ڈانواں ڈول ہے۔ اقتدار کی کش مکش نے وڈیروں کے گروہوں کو آپس میں لڑوا دیا ہے رجعت پسند اخبارات تو حسبِ معمول معتوب وڈیروں کو جمہوریت کا علمبردار ثابت کر رہے ہیں۔ حالانکہ جنگ یہ اقتدار کی ہے۔ جس جس کو اقتدار نہیں ملا ہے، وہ ناراض ہے۔ اور جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔ برسرِ اقتدار وڈیرے ان کے خلاف کارروائی کے لئے مختلف مقدمات کا سہارا لے رہے ہیں۔ ہر وڈیرہ، اغوا، قتل اور اسی قسم کے جرائم کا عادی ہوتا ہے۔ اپنے اثر و رسوخ سے بچ جاتا ہے۔ کسی سے بھی حکومت ناراض ہو تو اس قسم کے مقدمات قائم کرنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ آج کے کسی گورنر یا وزیر سے بھی کبھی کھٹ پٹ ہو گئی تو اس کو بھی انشاء اللہ ایسے ہی مقدمات میں ملوث کیا جائے گا۔ اس طرح پیپلز پارٹی اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ کارکن پہلے ہی بددل اور بدظن ہیں۔ اس تاثر کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد ولی خان سندھ کا دورہ کریں گے تو بہت سے وڈیرے اور سیاسی کارکن نیپ میں شمولیت کا اعلان کریں گے۔ سندھ میں نیپ کے لئے فضا زیادہ ہموار ہو گی۔ کیونکہ "سندھو دیش" کے قیام کے لئے دبی زبان سے جو باتیں چل رہی ہیں۔ ان کے لئے پناہ نیپ میں ہی مل سکتی ہے۔

ایک طرف یہ حالات ہیں، دوسری طرف صدر بھٹو۔ اپنے تختِ سلیماں ——— کو بہت مضبوط سمجھتے ہوئے ہر طرف محاذ کھولتے جا رہے ہیں ——— بائیں بازو کے جن دانش وروں طالب علموں، ادیبوں، شاعروں اور سیاسی کارکنوں نے بھٹو کو چین نواز، استحصالی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں، امریکی اور روس کے سامراجوں کا مخالف سمجھ کر حمایت کی تھی ——— اور بغیر کسی لالچ کے حمایت کی تھی ——— ان کا بھٹو سے رابطہ کٹ گیا ہے ——— اور صدر بھٹو نے ویت نام والے مظاہرہ کے سلسلے میں سیٹیٹ بنک ہال میں جو رویہ اختیار کیا۔ وہ انتہائی قابلِ افسوس

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں



قائداعظم کی ذات کو ملوّث کر کے راشدی کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟



راشدی!

قائداعظم اب اس کی تردید نہیں کر سکتے

شاہین

اپنے زمانے کے اردو قصیدہ نویسوں کے فکر کی بلندی اور سخن کی خوبی کا نقشہ حالیؔ نے کیا خوب کھینچا ہے۔

"قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیئے۔ ہر مشتِ خاک میں اکسیرِ اعظم کے خواص تبلائے، ہر چوبِ خشک میں عصائے موسویؑ کے کرشمے دکھائے ہر فرعونِ بے سامان کو قادرِ مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مدّاح بنے اسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا......"

اس دور کے شاعروں میں تو شاید مشکل ہی سے کوئی اس معیار پر پورا اترے۔ کیونکہ آج کل کے صاحبانِ اقتدار اور اہلِ ثروت عموماً شعر و ادب سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے لیکن نثر لکھنے والوں میں روزنامہ "جنگ" بسیار نویس بوجھ بجھکڑ پیر علی محمد راشدی بے شک مولانا حالی کے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ نثری قصیدہ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور مبالغے میں ان کی نثر شاعری کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے۔ "جنگ" کے ۲ مئی کے شمارے میں آپ نے صدرِ مملکت کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے ان کے گزشتہ تین چار سال کے سیاسی اور سرکاری دوروں کا مقابلہ چینی دیوزادے ماؤزے تنگ کے تاریخی اور تاریخ آفریں "لانگ مارچ" سے کیا تھا اور طولِ مسافت میں فرق کی بنا پر بھٹو صاحب کو ماؤ سے عظیم تر رہنما ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

پیر صاحب کے معیار کے مطابق پی آئی اے کا ہر پائلٹ بلکہ ریلوے کا ہر انجن ڈرائیور یا گارڈ بھی ماؤزے تنگ اور صدر بھٹو دونوں سے برتر ہے کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان دونوں سے زیادہ سفر کرتا ہے لیکن پیر صاحب صرف حاکمانِ وقت کی قصیدہ خوانی اور ان کے مخالفین کی تنقیص کے بادشاہ نہیں، وہ تعلّی میں بھی یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور کوئی موقعہ خود نمائی اور خودستائی کا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مثلاً جب صدر بھٹو کی شان میں لغو مبالغہ آرائی سے خود ان کا دم پھولنے لگا اور بعض اخباروں میں بھی اس پر "لے دے" ہوئی تو پیر صاحب نے خودستائی کی طرف

چھ صوبوں پر مشتمل پاکستان کا منصوبہ جو مکمّل نہ ہو سکا

رجوع فرمایا اور ۱۹ مئی کے جنگ میں مولانا غلام رسول مہر کی لائف کی آڑ میں اپنی سیاسی بصیرت اور دوربینی کا جلوہ دکھانے لگے۔ جو لوگ پیر صاحب اور ان کی کرامات سے واقف ہیں وہ تو بے سروپا پراپیگنڈہ کے اثر سے محفوظ ہیں، لیکن جوان سے بے خبر ہیں وہ ضرور اس بات پر افسوس کا اظہار کریں گے کہ پیر صاحب پندرہ بیس برس پہلے کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ تک پختہ عمر کو پہنچ جاتے، مسلمانانِ ہند کی قیادت سنبھال کر ان کی تاریخ کا رُخ پھیر دیتے اور یہ بدنصیب قوم پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت و اقتدار حاصل کر لیتی۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم یقیناً بڑے پائے کے عالم، ادیب اور صحافی تھے اور ہماری علمی اور ادبی تاریخ میں انہیں نہایت ممتاز مقام حاصل ہے لیکن وہ کوئی مدبّر یا سیاست دان نہ تھے اور ان کی تجویز تقسیم ہند کا جو خاکہ پیر صاحب نے پیش کیا ہے وہ قطعی ناقابلِ عمل اور مضحکہ خیز ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مسلمانوں کو برصغیر میں اپنی مجموعی آبادی کے تناسب سے رقبہ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کی مجوزہ اسلامی ریاست میں موجودہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ مشرقی پنجاب، دہلی، یو پی میں آگرے تک کا علاقہ، تمام راجپوتانہ، مغربی بنگال اور موجودہ آسام اور مشرقی بہار کے وہ اضلاع جن میں مسلم آبادی نصف کے قریب تھی، سب شامل ہوتے اور اس طرح وسیع و عریض ریاست میں مسلمانوں کی آبادی بقول پیر صاحب کے ۶۵ فیصد کے قریب ہوتی۔ اس کے علاوہ حیدر آباد دکن میں (جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۵ فیصد سے زیادہ نہ تھا) ایک الگ آزاد اسلامی ریاست قائم ہوتی ——!

حیرت ہوتی ہے کہ پیر صاحب نے، جو صحافی ہونے کے علاوہ سیاست دان اور ڈپلومیٹ بھی ہیں، اس تجویز کا خلاصہ اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اگر مسلم لیگ اس بنیاد پر تقسیمِ ہند کا مطالبہ کرتی تو کامیاب ہو جاتی اور مسلمانوں کے لیے وہ مصائب و مسائل بھی پیدا نہ ہوتے جو ہم سب پچھلے پچیس برس سے بھگت رہے ہیں۔ وہ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ "جس وقت قراردادِ لاہور مرتب ہوئی تو ہمارے لیڈروں کے پیشِ نظر یہی اسکیم تھی .... مگر بدقسمتی سے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء غلطیوں کے سال ثابت ہوئے ——!"

اس ضمن میں پیر صاحب نے متعدد "شدید غلطیوں" کی نشاندہی کی ہے۔ جن میں سب سے زیادہ سنگین یہ تھی کہ مہر صاحب کی تجویز پر (جسے پیر صاحب کی تائید و حمایت حاصل تھی) ڈٹ جانے کے بجائے ایسا پاکستان قبول کر لیا گیا جو صرف مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک قائداعظم نے اپنی



قائد اعظمؒ راشدی کی بات مان لیتے تو شاید پاکستان نہ بنتا

سوجھ بوجھ اور اپنے رفقائے کار اور نائبین کے مشورے کے بجائے پیر صاحب کی بصیرت اور تدبّر پر تکیہ کیا ہوتا تو نقشہ کتنا مختلف ہوتا۔ برصغیر میں اس وقت مسلمانوں کی دو یا تین عظیم الشان ریاستیں قائم ہوتیں۔ ایک شمال مغرب میں آگرے تک، دوسری شمال مشرق سے بہار تک اور تیسری دکن میں اور ان تینوں کے بیچ میں بھارت کی مجبور و بے بس ہندو مملکت عملاً ہمارے زیرِ نگین ہوتی بلکہ پیر صاحب نے تو یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے اگر ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کی قیادت جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر پیر صاحب کے "تصورِ پاکستان" کے حصول کے لیے ڈٹ جاتی تو بہت ممکن تھا کہ مسلمان دوبارہ سارے ہندوستان پر قابض ہو جاتے۔"

پیر صاحب کے ارشادات پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمان اس برصغیر کی سب سے بڑی سیاسی قوت تھے۔ ہندو اکثریت اور انگریز حکمران پر ان کا رعب و دبدبہ تھا اور بس ان کی چشمِ ابرو کے اشارہ کی دیر تھی کہ سارا ہندوستان ان کے قدموں میں ہوتا تحریک پاکستان کے رہنما کیسے لپست ہمت اور کج فہم تھے کہ ایسے درخشاں قومی مستقبل کے امکانات گنوا کر بقول پیر صاحب کے "لنگڑا لولا" پاکستان قبول کر لیا۔ یہ کب غضب ہو گیا کہ قائدِ اعظمؒ نے تجویزِ پاکستان کے متن میں تو پیر صاحب کے مشورے سے ایسی ترمیم کر دی جس کی رو سے پاکستان کا جھنڈا لال قلعے، تاج محل اور دکن کے چار مینار پر لہرایا جا سکتا تھا لیکن اس کے بعد مسلم لیگ کی قیادت نے پیر صاحب کو بھلا دیا، نتیجہ معلوم کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ قوم کا قافلہ پست ہمتی کی وادیوں میں بھٹک گیا۔ پچھلے پچیس برس کے جملہ فسادات اور مسلمانوں کے تمام مصائب و آلام کا باعث یہی غلطی تھی۔

پیر صاحب بہرحال پیر ہیں اور ان کے تخیّل کی پرواز تک ہماری رسائی ممکن نہیں لیکن تاریخی واقعات اور جغرافیائی حقائق کو انہوں نے جس بے دردی سے توڑا مروڑا ہے اس سے ہماری سیاسی تاریخ کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، لہٰذا ان کی غلط بیانیوں اور گمراہ کن تاویلات کا ازالہ ضروری ہے ——!

تحریک پاکستان کی تاریخ پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ حامی، مخالف اور غیر جانبدار سبھی اس پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ لیکن آج تک کسی مستند تصنیف میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ جس وقت قرارداد لاہور مرتب ہوئی تو ہمارے لیڈروں کے پیشِ نظر یہی (مولانا مہروالی) اسکیم تھی۔ یہ تو ممکن کہ پیر صاحب سے پہلے کسی مصنف نے اس موضوع پر تحقیق کا حق پوری طرح ادا نہ کیا ہو اور یا تو وہ سب اس تاریخی حقیقت سے بے خبر رہے ہوں یا انہوں نے اس کی اہمیت کا احساس نہ کیا ہو لیکن اس تجویز (جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے) اور قرارداد لاہور میں جو بُعد اور منطقی تضاد پایا جاتا ہے اس کو پیر صاحب کس وظیفے سے رفع کریں گے؟ قراردادِ لاہور ہندی مسلمانوں کے علاقائی حق خود ارادیت پر مبنی ہے اور اس خصوص میں اس کے الفاظ غیر مبہم ہیں۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے جن خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں انہیں مکمل سیاسی خود مختاری ملنی چاہیے۔

"کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاسِ عام پورے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہندوستان کے آئینی مستقبل کے متعلق صرف وہی نتیجہ قابلِ عمل اور مسلمانوں کو قبول ہو گا جو مندرجہ ذیل اصول پر مبنی ہو اور وہ یہ کہ باہم دگر ملحق صوبوں کی سرحدوں میں ضروری ردّ و بدل کے ساتھ ان کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ ان علاقوں میں آزاد ریاستیں قائم ہو سکیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطے ..... !"

اب اس تجویز میں دہلی اور آگرے، راجپوتانے اور مشرقی بہار کی گنجائش کس طرح نکالی جائے۔ جو مسلم اکثریت کے علاقوں سے سینکڑوں میل دور تھے؟ اور پھر حیدرآباد دکن کی اسلامی ریاست کیسے اس میں سمائے۔؟ اور اگر منطق اور جغرافیہ کا خون کر کے پیر صاحب کی بات مان بھی لی جائے تو جمع تفریق کے اٹل قاعدوں کو توڑ کر یہ کیسے تسلیم کر لیا جاتے کہ ۱۹۴۰ء میں پیر صاحب کے عالم تصور میں پاکستان کا جو نقشہ تھا۔ اس میں مسلمانوں کی ۵۰ فی صد اکثریت ہوتی؟ پیر صاحب نے یوپی اور بہار کے ان اضلاع کی نشان دہی نہیں فرمائی جو اُن کے خیال میں پاکستان میں شامل کئے جا سکتے تھے، اس لئے صحیح صحیح تخمینہ لگانا تو مشکل ہے لیکن ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی صوبائی اور فرقہ وارانہ تقسیم پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بنگال، آسام، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور برٹش بلوچستان کی آبادی مجموعی طور پر دس کروڑ ۲۰ لاکھ تھی

پیر صاحب کی ریاضی اور جغرافیے کا حال بہت بُرا ہے

جس میں سے پانچ کروڑ ۹، لاکھ مسلمان تھے اور ان کا تناسب قریب ۵۵ فی صد تھا۔ اب اگر پاکستان کی سرحدیں ان پانچ صوبوں کی سرحدوں سے تجاوز کر کے دہلی۔ مغربی یوپی، راجپوتانہ اور مشرقی بہار کا بھی احاطہ کر لیتیں۔ جہاں ہندوؤں کی زبردست اکثریت تھی، تو کل پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۵ فی صد سے بڑھ کر ۶۵ فی صد کس طرح ہو جاتا۔ یوپی اور بہار کے "پاکستانی" اضلاع کو چھوڑ کر، جن کی نشان دہی پیر صاحب نے نہیں کی۔ اور دہلی اور راجپوتانہ کی ریاستوں کو شامل کر کے جو پاکستان بنتا اس کی کل آبادی تقریباً بارہ کروڑ اور مسلم آبادی چھ کروڑ ہوتی اور اس میں یو۔ پی اور بہار کے کچھ علاقے بھی شامل کر دیئے جاتے تو مسلمان کل ریاست میں اقلیت بن کر رہ جاتے اور جموں و کشمیر کے تینتس (۳۰) لاکھ مسلمانوں کی شمولیت کے بعد بھی اقلیت ہی میں رہتے۔ ایسی مملکت میں تو پیروں کی کرامات کے ذریعے ہی اسلامی حکومت قائم ہو سکتی۔ غالباً راشدی صاحب نے سوچا ہو گا کہ بات پرانی ہو چکی ہے اور مسلمان یوں بھی ریاضی میں کچے ہیں۔ کون مردم شماری کی کھتونیوں میں سے جمع تفریق کرتا رہے گا۔ جو چاہو لکھ دو۔

یہ تو ہوا پیر صاحب کی ریاضی اور جغرافیے کا حال۔ آیئے اب ان کی منطق اور تدبر اور دور اندیشی کے دعوے کا بھی جائزہ لیں۔ فرماتے ہیں کہ

"قرارداد لاہور کے مسودے میں آخری وقت جو درستی میں نے پیش کی تھی اور جس کو قائد اعظم نے منظور فرما کر مسودے میں شامل کر دیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ مولانا مرحوم کے تیار کردہ تقسیم کے نقشے پر عمل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے"

گویا ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ صوبوں کی حدود میں ضروری ردوبدل، (such teritorial —— readjustments as may be found necessary) کے ذریعے پاکستان کا علاقہ مغرب میں پنجاب کے علاوہ، دہلی، آگرہ اور راجپوتانہ، اور مشرق میں بنگال اور آسام کے علاوہ مشرقی بہار پر محیط ہو۔ لیکن افسوس مسلمانوں کی کج فہمی اور کوتاہ بینی پر کہ پیر صاحب کے اس زبردست مدبرانہ داؤں کی داد دینا تو کجا اسے سمجھ بھی نہ سکے اور تحریک پاکستان کے سات سال کے عرصے میں ان کے کسی رہنما کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ان چند لفظوں میں جو عظیم الشان مطالبہ مضمر تھا۔ اس کے حصول پر اصرار کرتے۔ مسلم لیگ کی تمام قراردادیں اور قائد اعظم کی تمام تقریریں اور بیانات پڑھ جایئے۔ کہیں اس فقرے کی وہ تاویل نہیں ملتی جو راشدی صاحب نے ۲۴ برس کے بعد فرمائی ہے۔ اس کے برعکس ۴، اکتوبر ۱۹۴۴ء کو بمبئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے واضح کر دیا کہ قرارداد لاہور میں جس پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ برٹش انڈیا کے چھ صوبوں یعنی آسام، بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر محیط ہو گا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے قرارداد کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کی رو سے ملک کی تقسیم ان چھ صوبوں کی "موجودہ سرحدوں" کی بنا پر ہونی چاہیئے لیکن ضرورت کے مطابق ان سرحدوں میں کچھ ردوبدل بھی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ "یہ ردوبدل دو طرفہ عمل ہو گا اور اصولِ تقسیم کے سمجھوتے کے بعد دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی سے اس کا فیصلہ ہو گا، جیسے عام طور پر دو آزاد قوموں کے مابین سرحدوں کا تعین کیا جاتا ہے" (Speeches And writings of MR. Jinnah — Edited By Jamil uddin Ahmed, Vol. II) ظاہر ہے کہ صوبوں کی موجودہ سرحدوں کی بنا پر اصولی معاہدے کے بعد سرحدوں میں کوئی لمبی چوڑی تبدیلی تو ناممکن تھی۔ صرف انتظامی اور دوسری سہولتوں کے پیش نظر لین دین کے ذریعے تھوڑا بہت ردوبدل ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ پیر صاحب نے اپنی کرامات کے ذریعے اس محدود ردوبدل کا دائرہ دہلی، آگرے، راجپوتانے اور مشرقی بہار تک پھیلانے کا کوئی منصوبہ اپنے ذہن میں تیار کر لیا ہو، لیکن افسوس کہ اپنی ترمیم قائد اعظم کی خدمت میں پیش کرتے وقت وہ انہیں اس کے انقلابی مضمرات سے آگاہ کرنا بھول گئے۔

جسٹس کیانی مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ

"اگر میں آپ سے کہوں کہ جب میں قائد اعظم سے ملا تو میں نے انہیں مفید مشورہ دیا۔ جس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ مجھ سے دو سال پہلے ملے ہوتے تو پاکستان پہلے بن گیا ہوتا، تو آپ مان لیں گے...... کیونکہ قائد اعظم تو اب اس کی تردید نہیں کر سکتے۔"

سو ہم آنا تو مانے لیتے ہیں کہ قائد اعظم نے پیر صاحب کے حسب ارشاد قرارداد پاکستان میں درستی فرمائی۔ لیکن پیر صاحب اس ترمیم کی جو تاویل آج فرما رہے ہیں وہ اگر قائد اعظم قبول کر لیتے اور مان پڑ جاتے تو شاید پاکستان وجود ہی میں نہ آتا۔

عوامی ٹرسٹ ۔ داؤد فاؤنڈیشن کے لاکھوں روپے خرد برد کر دیئے گئے

داؤد فاؤنڈیشن ۔ پردہ چاک

داؤد فاؤنڈیشن کے فنڈ کے استعمال پر داؤد اور یحییٰ خاں کا سمجھوتہ

الفتح رپورٹ

The emergence of the Dawood College of Engineering & Technology at M. A. Jinnah Road is a unique feature in the field of technical and scientific education in the country. The college which has all the modern educational facilities has been built at a cost of Rs 70 lakh, with Rs. 7 lakh as its recurring expenditure. The tuition fee for the students is only rupee one which is about the lowest in the world over. In addition every student has been insured for Rs. 10,000-00 by the college itself against all risks of injury or death while at work in the college workshop or laboratory or anywhere on official assignment.

محمد علی جناح روڈ پر داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کی تعمیر ملک کی سائنسی اور ٹیکنیکی تعلیم کے میدان میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ اس کالج کی تعمیر پر ستر لاکھ روپے صرف ہوئے اور سات لاکھ روپے کا مستقل خرچ اسکے علاوہ ہے اس درسگاہ میں جدید ترین تعلیمی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں مگر اسکے باوجود ماہانہ فیس صرف ایک روپیہ ہے جو شاید دنیا بھر میں سب سے کم ہے مزید برآں کالج کی جانب سے ہر طالب علم کا دس ہزار روپے کا بیمہ بھی کرایا جاتا ہے تاکہ اگر کالج کی ورکشاپ یا تجربہ گاہ میں کام کرتے ہوئے یا کالج کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی طالب علم ہلاک یا زخمی ہو جائے تو اس کو معاوضہ ادا کیا جا سکے۔

صدیق داؤد کے انتخابی منشور کے ایک اقتباس کا عکس

داؤد خاندان کا شمار پاکستان کے گنے چنے ان بائیس اجارہ دار سرمایہ داروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے غیر ملکی سرمایہ کے سہارے ملک کے تمام ذرائع پیداوار پر ناجائز قبضہ جما لیا۔ اور قومی معیشت کو سامراج کی بین الاقوامی حکمت کے مکمل طور پر تابع بنا دیا۔ یہ خاندان مختلف طریقوں اور ہتھکنڈوں سے عوام کو نوچنے کھسوٹنے میں پیش پیش رہا۔ جہاں صنعتی دنیا اس کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنی، وہاں تعلیمی درس گاہیں بھی اس کے دستِ برد سے نہ بچ سکیں ۔۔۔ داؤد فاؤنڈیشن ۔۔۔ اس خاندان کے استحصالی رویے کی زندہ مثال ہے۔ اس فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے کالجوں بالخصوص داؤد انجینئرنگ و ٹکنالوجی کالج کراچی کو اس خاندان نے جس طرح اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور طلباء اساتذہ کو بنیادی سہولتوں سے محروم رکھا وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ علم و حکمت کا شعبہ بھی ان کی ہوسناکی اور بے رحمی سے محفوظ نہ رہ سکا۔

داؤد فاؤنڈیشن

یہ ادارہ ایک عوامی ٹرسٹ ہے۔ جس کے چلانے اور دیکھ بھال کی ذمہ داری گورننگ باڈی یا بورڈ آف ٹرسٹی کو سونپی گئی، لیکن یہ کنٹرولنگ اتھارٹی داؤد خاندان کے سامنے عضوِ معطل ہے۔ دوم اس میں زیادہ تر افراد داؤد خاندان سے ہیں۔ اس برائے نام عوامی ادارے کا سارا کاروبار داؤد خاندان کے زیرِ اثر ہے۔ اگر سرکاری آڈیٹروں پر مشتمل ایک اعلیٰ اور با اختیار کمیٹی اس ادارے کے حساب کتاب کی چیکنگ کرے تو بدعنوانی، خرد برد اور بد انتظامی کے گلہائے رنگا رنگ دریافت ہوں گے۔ داؤد خاندان کا پول کھل جائے گا کہ اس نے کس طرح تعلیم کے مقدس نام کو حصولِ زر کا ذریعہ بنایا تحقیقاتی کمیٹی کا با اختیار ہونا ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ داؤد دولت مند بھی ہے اور با اثر بھی ۔۔۔ سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ پر بڑا غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔ چھوٹے موٹے لوگوں کے بس کی بات نہیں کہ اس خاندان کی دھاندلیوں کا پردہ چاک کر کے انصاف کے تقاضوں کو پورا کریں۔

انجینئرنگ اسٹوڈنٹس ویلفیئر ایسوسی ایشن کراچی کے صدر کا کہنا ہے کہ ہماری نام نہاد اعلیٰ سوسائٹی کی بدعنوانی اور بد اعمالی کا پتہ چلانے کے لئے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تحقیقات ضروری ہے۔ اور اس کہاوت کا زندہ کرنا چاہیے کہ "ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ پیدا ہوتا ہے۔"

داؤد فاؤنڈیشن کا پس منظر

ایوب دور میں داؤد خاندان کا سیاست پر بڑا گہرا اثر قائم ہوا۔ داؤد فاؤنڈیشن کے چیئرمین مسٹر احمد داؤد سیاست میں براہ راست حصہ لینے کے لئے پر تول رہے تھے۔ چنانچہ زمین ہموار کرنے اور ووٹروں کو استعمال کرنے کے لئے داؤد فاؤنڈیشن کا منصوبہ تیار کیا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۶۲ء کو انہوں نے سابق صدر ایوب خان کو لکھا۔

"اگر حکومت نے اس سکیم کی منظوری دے دی اور ضروری سہولتوں کے علاوہ اخلاقی امداد کا سہارا دیا تو کم سے کم مدت میں ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کالج کے قیام میں داؤد فاؤنڈیشن ہر قسم کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ مستقل اخراجات بھی برداشت کرے گا ۔۔۔" ایوب خان نے ان الفاظ میں اس کی منظوری دے دی

"داؤد فاؤنڈیشن کے تحت کراچی میں داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کے

ایوب خاں کے حکم پر داؤد کے خلاف تحقیقات کو دبا دیا گیا

قیام کا منصوبہ قابل ستائش ہے۔"

۲۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو داؤد فاؤنڈیشن کے چیئرمین مسٹر احمد داؤد نے ایڈ ہاک کمیٹی کے اجلاس میں اپنے عہد کی تجدید کرتے ہوئے کہا۔

"داؤد فاؤنڈیشن کی اسکیم کے مطابق کراچی میں انجینئرنگ کالج، چھ کالجوں کے قیام کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہر کالج کی تعمیر پر ۷۰ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے، جب کہ مستقل اخراجات کی صورت میں سات لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوں گے۔"

انتخابی منشور

۱۹۶۵ء میں داؤد خاندان کے ایک فرد مسٹر صدیق داؤد نے اپنے منصوبے کے مطابق الیکشن لڑنے کا اعلان کیا اور فروری ۱۹۶۵ء میں اپنے انتخابی منشور میں کہا —— "جدید سہولتوں سے مزین انجینئرنگ کالج کی تعمیر پر ۷۰ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ جب کہ مستقل اخراجات کی صورت میں سات لاکھ روپے اس کے علاوہ ہیں۔ اس درس گاہ کو جدید ترین سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی فیس ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ جو شاید دنیا بھر میں سب سے کم ہے۔ مزید براں کالج کی جانب سے ہر طالب علم کا دس ہزار روپے کا بیمہ کرایا جاتا ہے۔ تاکہ اگر کالج کی ورک شاپ یا تجربہ گاہ میں کوئی طالب علم کسی تجرباتی حادثے کا شکار ہو جائے تو اسے معاوضہ ادا کیا جا سکے۔"

صدیق داؤد کے انتخابی منشور کی یہ باتیں یقیناً خوشکن ہیں۔ مگر اس بات کا خیال رہے کہ یہ الیکشن کے دوران ایک امیدوار کے ہتھکنڈے ہیں جو انتخابات جیتنے کے لئے ووٹروں کو فریب دینا چاہتا ہے۔ صدیق داؤد کے انتخابی منشور میں مذکورہ باتیں کس حد تک صحیح ہیں۔ اس کا اندازہ درج ذیل حقائق سے لگایا جا سکتا ہے۔

داؤد خاندان نے کالج کی تعمیر پر ۷۰ لاکھ روپے خرچ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ نیز مستقل اخراجات کے لئے ۷ لاکھ روپے کا وعدہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس کالج کی تعمیر پر —— ۱۹۶۳ء سے لے کر مارچ ۱۹۶۶ء تک صرف ۲۸ لاکھ ایک ہزار ۷۵۰ روپے خرچ کئے گئے۔ کہاں ۷۰ لاکھ اور کہاں ۲۸ لاکھ۔ مستقل اخراجات کی صورت میں ۷ لاکھ روپے خرچ کرنے کا وعدہ تھا مگر ۱۹۶۳ء سے لے کر مارچ ۱۹۶۶ء تک صرف ۳ لاکھ ۸۰ ہزار اور ۳۴۳ روپے خرچ کئے گئے۔

قول و عمل میں تضاد

داؤد خاندان نے ۷۰ لاکھ روپے کا وعدہ کیا جب کہ ۲۸ لاکھ اور چند سو روپے خرچ کئے گئے۔ مستقل خرچ کی صورت میں سات لاکھ روپے کا وعدہ کیا گیا اور صرف ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ۳۴۳ روپے خرچ کئے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں قارئین اس اجارہ دار خاندان کی وعدہ خلافیوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کالج کے قیام کا منصوبہ ۲۸ لاکھ روپے میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ صرف ورک شاپ اور تجربہ گاہ کی تعمیر پر ۲۵ لاکھ روپے کا خرچ بیٹھتا ہے۔ کیا سالانہ سات لاکھ کے بجٹ کے مقابلے میں صرف ایک لاکھ ۱۹ ہزار روپے سے ایک انجینئرنگ کالج کو کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے؟ یہ اعداد و شمار داؤد خاندان کی دروغ گوئی کا منہ چڑاتے ہیں:

"داؤد فاؤنڈیشن ایک عوامی ٹرسٹ ہے۔ مگر اسے خاندانی امور میں شامل کر لیا گیا۔ کالج ایک قومی ادارہ ہے۔ مگر اس کو نجی املاک کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کو ایک خاندان کے چنگل سے نجات نہیں دلائی جا سکتی۔" یہ سوال داؤد کالج انجینئرنگ کالج کی مجلس عمل کی جانب سے کیا گیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو انگریزی روزنامہ ڈان میں خبر رساں ایجنسی پی پی اے کے ذریعہ ایک خبر شائع کرائی گئی جس میں داؤد خاندان نے دعوے کیا کہ داؤد فاؤنڈیشن نے کالج کی تعمیر پر ۴۴ لاکھ خرچ کئے۔ جب کہ فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹ میں جون ۱۹۶۴ء تک حقیقی اخراجات پر صرف ۸۰ ہزار ۱۴۷ روپے اور محفوظ املاک پر صرف ۳۹ ہزار ۲ سو ۲۲ روپے درج ہیں اس طرح کل اخراجات ایک لاکھ ۱۹ ہزار ۳ سو ۶۹ روپے ہوتے ہیں۔ اخبار کے ذریعہ غلط اعداد و شمار شائع کر کے طلباء اور عوام کو انتہائی دیدہ دلیری سے بیوقوف بنانے کی کوشش کی گئی۔

داؤد فاؤنڈیشن نے کراچی کی "ہولی قرآن سوسائٹی" کو پانچ ہزار روپے کا عطیہ دینے کا اعلان کیا۔ سوسائٹی کے عہدے داروں نے متعدد بار فاؤنڈیشن سے رجوع کیا اور اعلان کردہ عطیہ کا مطالبہ کیا۔ مگر عطیہ کی رقم سوسائٹی کو نہ دی گئی۔ اتفاق سے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں سوسائٹی کے علم میں یہ بات آئی کہ فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار کی رقم کی ادائیگی دکھائی گئی ہے۔ جب سوسائٹی والوں نے فاؤنڈیشن کے اعزازی سیکرٹری اور خازن مسٹر صدیق داؤد سے اس بات پر احتجاج کیا تو انہیں ۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی تاریخ میں سوسائٹی کے اکاؤنٹ میں جاری شدہ چیک نمبر دکھا کر دریائے حیرت میں ڈال دیا گیا۔ فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹ میں اتنا زبردست گھپلا۔ آخر آڈیٹروں نے ۱۹۶۳-۶۴-۶۵ء کے اکاؤنٹ کو کس طرح چیک کیا اور کس طرح تصدیق کر دی —— ؟ مذہبی ادارے کے عہدے دار تو اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔

اسٹار کنسٹرکشن کمپنی

یہ داؤد کی ایک معاون کمپنی ہے جسے کالج کی تعمیر کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اس کمپنی کے سربراہ حاجی عمر غنی ہیں جو احمد داؤد کے رشتہ دار ہیں۔ یہ صاحب داؤد فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں میں بھی شامل ہیں۔ کالج کی تعمیر کے دوران داؤد فاؤنڈیشن کے عملے سے اس کمپنی میں کام لیا گیا۔ اس کے علاوہ تعمیراتی سامان داؤد فاؤنڈیشن کے فنڈ سے خریدا گیا۔ اس طرح احمد داؤد نے اپنے ایک رشتہ دار کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لئے فاؤنڈیشن کے عملے اور فنڈ کو ناجائز طور پر استعمال کیا۔

بوائلر اسکنڈل

۱۹۶۴ء میں مسٹر صدیق داؤد نے کالج کے لئے اپنی ایک کمپنی "موسیدا" سے ایک گرانقدر بوائلر خریدنے کی کوشش کی۔ واضح رہے کہ موسیدا کمپنی داؤد خاندان کی ہے۔ کالج کے پرنسپل نے اس کی قیمت پر اعتراض کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس سے کہیں کم قیمت پر امریکی بوائلر خریدیں۔ اس بات پر مسٹر صدیق داؤد ان سے ناراض ہو گئے اور بوائلر کی خریداری کا ارادہ ترک کر دیا۔

کالج کے سامان کی خریداری

کالج کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زیادہ تر سامان داؤد کارپوریشن انڈسٹریز کے شعبہ خریداری کی جانب سے خریدا گیا۔ نیز کھاتے میں صحیح اخراجات کی بجائے بڑی بڑی جھوٹی رقمیں درج کر دی گئیں۔

کالج کا بجٹ

داؤد خاندان نے آج تک کالج کو سالانہ بجٹ دکھانے

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں



خیراتی انجمن کیئر

امریکی محکمہ خارجہ کے لئے

جاسوسی کرتی ہے

خالد شاہ ۱۹۵۳ء میں امریکہ چلے گئے تھے۔ وہاں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ انہوں نے امریکی قومیت اختیار کر لی۔ C.B.S اور کنساس سٹی اسٹار کے نمائندے کی حیثیت سے انہوں نے کئی ملکوں میں کام کیا ہے۔ وہ ویت نام میں بھی صحافیانہ خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آج کل وہ اور ان کی بیوی لنڈا شاہ امریکہ کی بائیں بازو کی تحریک سے منسلک ہیں۔ وہ آج کل مختلف ممالک کا دورہ کر رہے ہیں اور پاکستان سے چین جانے کا ارادہ رکھتے ہیں ——— (ادارہ)

کیئر کا ایک اعلیٰ افسر ڈھاکہ کی تفصیلات سمیت دہلی پہنچ گیا

خالد شاہ

امریکی خیراتی انجمن "کیئر" کے برصغیر پاک و ہند کے کام کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس انجمن کے سجے سجائے آفسوں، رہائشی مکانوں کے پیچھے جذبہ خیرسگالی کے برخلاف کوئی اور ہی مقصد کام کر رہا ہے۔ انجمن کا امدادی کام بالکل معمولی ہے۔ "کیئر" امریکی محکمہ خارجہ کے اصل کام کو امداد کے پردے میں کر رہا ہے اور امریکی عوام کو مسلسل دھوکے میں رکھے ہوئے ہے کہ "کیئر" خالص امدادی انجمن ہے!

اس انجمن کے ذمہ دار افسران ڈھکی چھپی باتیں کرتے ہیں اور ایسے سوالات کے جواب دینے سے کتراتے ہیں جو ان کی کارروائیوں کی گہرائی میں جاتے ہوں۔ آج سے تین ماہ قبل "کیئر" نے سرکاری طور پر امریکہ میں کہا کہ مشرقی پاکستان سے مہاجرین مغربی پاکستان میں نہیں آئے ہیں۔ "بنگلہ دیش" میں مسئلہ غذائی قلت کا نہیں ہے اور بہاریوں کے مسئلے پر کراچی میں "کیئر" کے کارکنوں کو اس لیے معلومات نہیں ہیں کہ "بنگلہ دیش" سے کسی قسم کی اطلاعات نہیں آ رہی ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے وہ امریکہ کے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک غیر سیاسی انجمن ہے اور کسی ملک کے معاملات میں کسی قسم کی سیاسی دخل اندازی نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ کسی قسم کی سیاسی انجمن ہو تو اسے اپنے فنڈ پر اور اپنی آمدنی پر امریکی قانون کے تحت ٹیکس دینا پڑ جائے لیکن خالص انسانی اور سیاسی دونوں میدانوں میں یہ انجمن عوام کو صریح دھوکہ دے رہی ہے۔

خواہ ملکوں کے آپس کے تعلقات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ سرحدوں پر خونریز جنگ ہی کیوں نہ ہو رہی ہو "کیئر" کے کارکنوں کا آپس کا رابطہ ٹوٹنے نہیں پاتا جب ہم بمبئی میں تھے تو اس انجمن کے کارکنوں نے ہمیں اسی قسم کی امدادی کارروائیوں اور طریقوں کی اطلاعات دیں جو کہ جنگ کے بعد کراچی میں اس انجمن کے کارکنوں نے یہاں پر ہمیں دیں۔ ان تمام کارکنوں کو خواہ وہ کسی بھی ملک سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ ہدایات امریکہ کے صدر دفتر سے ہی جاری کی جاتی ہیں۔ انجمن کے کارکنوں نے ہماری اس اطلاع کی بھی تصدیق کی کہ دراصل ان کا تمام سرمایہ حکومتِ امریکہ کے امدادی فنڈ سے آتا ہے جو حکومتِ امریکہ نے دنیا بھر میں مختلف منصوبوں کی تکمیل کے لیے الگ سے منظور کر رکھا ہے۔ اس طرح پتہ چلتا ہے کہ سوشل ورک کے پردے میں یہ انجمن جتنے بھی اسکول یا مکان یا کارخانے بناتی ہے جن کو بنانے کے لیے یہ مزدوروں کو آدھی اجرت اور ایک وقت کی روٹی پر مزدوری دیتی ہے۔ وہ سب امریکی حکومت کے امدادی کام ہیں اور ان کاموں سے امریکی حکومت کے مفادات وابستہ ہیں۔

رابرٹ ویلوان "کیئر" کے نیویارک کے دفتر کے افسر تعلقاتِ عامہ ہیں۔ انہوں نے ہم کو بتایا کہ ان کی انجمن برصغیر پاک و ہند میں غذائی امداد کے لیے کسی قسم کے عطیات قبول نہیں کرے گی اور غذائی امداد کے سلسلے میں صرف امریکی امداد کے فنڈ پر بھروسہ کرے گی۔ رابرٹ ویلوان اپنے اس عہدے سے پہلے امریکی محکمہ خارجہ میں تھے۔ اور ان کے اس محکمہ سے خصوصی تعلقات ہیں۔ انہوں نے بڑے فخر سے ہمیں بتایا کہ غذائی امداد کے سلسلے میں انہوں نے یونی سیف (UNICEF) سے معاہدہ کر رکھا ہے اسی قسم کے معاہدوں کی بنا پر اس انجمن نے امریکی ٹی وی پر ایک اشتہار دیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ ۱۹۷۱ء میں یہ انجمن بنگال میں امدادی کام کر رہی تھی۔ درحقیقت سارا کام (UNICEF) کا عملہ کر رہا تھا۔ ایک اور امریکی انجمن نے اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کیا۔ اور "کیئر" کو اس اشتہار کی نمائش روکنی پڑی۔

بمبئی میں اس انجمن کے کارکنوں نے ہم سے اصرار کیا کہ ان کی انجمن دورانِ جنگ "بنگلہ دیش" میں موجود تھی۔ اگر ہم بمبئی کے کارکنوں کی بات مان لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب امدادی کام اور غذائی امداد یونی سیف کا عملہ پہنچا رہا تھا تو پھر "کیئر" کے کارکن "بنگلہ دیش" میں کس قسم کی "کارروائی" میں مصروف تھے ہمارے شکوک کو اور تقویت "کیئر" کے کراچی کے کارکن کے بیان سے پہنچی جس نے ہمیں بتایا کہ دورانِ جنگ وہ وار ڈان کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اور ڈیفنس کالونی سے اس کے پڑوسی تمام پاکستانی فرار ہو چکے تھے۔

"کیئر" کے کارکنوں کے لیے ملکوں کی سرحدیں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ بڑے آرام سے ان جگہوں تک پہنچ سکتے ہیں جہاں سفارتی نمائندوں تک کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ایک امریکی ڈان سانگ "کیئر" کے کراچی کے دفتر

جنگ سے قبل جم بارڈن نے ڈھاکہ کی خفیہ فلم تیار کی تھی

ہیں مشرقی پاکستان کے معاملات کے سربراہ تھے ان کے زیر نگرانی ایک منصوبہ تھا جس میں ڈھاکہ کے اطراف ساٹھ مربع میل کے علاقے میں مکانات کی تعمیر شامل تھی۔ جون ۱۹۷۱ء میں ڈان سائیک کا تبادلہ کراچی سے اس انجمن کے دہلی کے دفتر میں کر دیا گیا۔ یقیناً وہ اپنے ساتھ اس منصوبے کے تمام نقشہ جات جس میں ڈھاکہ کے اطراف کی تمام تر تفصیلات ہیں اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور یقیناً ان نقشوں سے ڈھاکہ پر بھارتی حملہ آوروں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس طرح جم بارڈن اور ان کی بیوی امریکی پیس کور کی طرف سے ۱۹۶۶ء میں ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ بھیجے گئے تھے بعد میں ان کو کابل بھیج دیا گیا۔ پیس کور میں کام ختم کرنے کے بعد جم بارڈن نے فوٹو گرافی شروع کر دی ۱۹۷۱ء کی گرمیوں میں "کیر" نے خاص طور پر جم بارڈن کو ڈھاکہ کے متعلق سولہ ملی میٹر کی ایک فلم بنانے کے لیے مشرقی پاکستان بھیجا۔ جم بارڈن کی بنائی ہوئی یہ فلم کسی کو نہیں دکھائی گئی۔ ہم بھی یہ فلم نہیں دیکھ سکے لیکن نیویارک کے دفتر میں "کیر" کے افسرِ تعلقاتِ عامہ نے جم بارڈن کی کھینچی ہوئی کابل کی فلمیں ہمیں دکھائیں۔ ان فلموں میں جو کہ خفیہ نہیں تھیں ہم نے ایک بات ضرور دیکھی اور وہ یہ کہ جم بارڈن کو وسیع زاویے (WIDE ANGLE) کی تصاویر لینے میں خصوصی مہارت ہے اور ان کی تصاویر میں ایک ایک چیز بہت نمایاں ہوتی ہے۔ جم بارڈن نے ڈھاکہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کن کن چیزوں کی فلم بنائی ہوگی؟ یہ فلم کیوں خفیہ رکھی گئی؟ اور اس فلم کو کن کن لوگوں نے دیکھ کر کیا کیا فوائد اٹھائے ہوں گے اس کا اندازہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔ ہمیں حیرانی اس بات پر ہے کہ امریکہ کے اور دیگر ممالک کے ٹی وی کے ادارے دیگر ملکوں میں فلم بنانے کے لیے وہیں کے مقامی کیمرہ مینوں سے فوٹو گرافی کراتے ہیں۔ "کیر" کی فلم اس قدر خفیہ ہوتی ہے کہ وہ مقامی کیمرہ مینوں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ دس ہزار ڈالر خرچ کر کے اپنے مخصوص کیمرہ مین امریکہ سے بھیجتے ہیں جو ان فلموں کو بناتے ہیں۔ ایک خیراتی انجمن جو امریکہ میں اشتہار دیتی ہو کہ دس ہزار ڈالر میں ایک لاکھ آدمیوں کی ایک دن کی غذا مل سکتی ہے صرف ایک فلم کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنی رقم خرچ کر ڈالے یہ بات ضرور حیران کن ہے۔

امداد حاصل کرنے والے ممالک کا "کیر" کی کارروائیوں پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں ہوتا نہ ہی وہ اس انجمن کی امدادی کارروائیوں کے لیے کسی قسم کا عطیہ دے سکتے ہیں۔ "کیر" صرف امریکہ میں عطیات وصول کرتی ہے۔ اور صرف امریکی ڈالروں میں ہی عطیہ دیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ امریکہ میں رہنے والے پاکستانیوں اور بھارتی لوگوں کے عطیات بھی مختلف بہانوں سے رد کر دیئے جاتے ہیں۔

اوکسفام (OXFAM) چرچ ورلڈ سروس انٹرنیشنل انٹرنیشنل ریسکیو کمیٹی اور اسی قسم کی دوسری امدادی انجمنوں کے صاحب لوگوں کی حقیقی کارروائیوں کے متعلق تمام تر معلومات حاصل کرنا دشوار کام ہے لیکن ایک چیز جو صاف ظاہر ہے کہ رہن سہن کے معاملے میں یہ صاحب لوگ عیش کر رہے ہیں۔ بمبئی کے "کیر" کے کارکنوں کے اپنے غذائی استعمال کی اشیاء سنگاپور کے ایک سپر مارکیٹ سے درآمد کی جاتی ہیں۔ کراچی میں ان کے نمائندے کے

انجمن کے کارکن امریکی محکمہ خارجہ کے افسران ہوتے ہیں

لیے خاص طور پر امریکہ سے چائے منگائی جاتی ہے۔ یہ صاحب اپنے آپ کو غذائیت کا ماہر بتاتے ہیں حالانکہ ان کی تمام تر قابلیت یہ ہے کہ یہ صاحب ہلٹن ہوٹل میں کام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والا پاکستانی سٹاف تعلیمی اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ قابل ہے لیکن تنخواہ ان کی پاکستانیوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ "کیر" کے لوگ کبھی کسی پاکستانی یا ہندوستانی کو اپنے ملک میں کام کرنے نہیں بھیجتے۔ ان کے زیادہ تر ملازمین امریکی وزارتِ خارجہ کے پرانے افسران یا پیس کور کے پرانے والنٹیئر ہوتے ہیں۔ ان امریکیوں کو شروع ہی سے ایک لاکھ روپے سالانہ کی تنخواہ پر لیا جاتا ہے۔ اس بہانے پر کہ یہ لوگ پسماندہ علاقوں میں کام کر رہے ہیں چھٹیاں اور الاؤنس الگ سے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ کسی بھی علاقے میں کام کریں ان کے مکانات شہر کی بہترین بستیوں میں ہوتے ہیں عیش کے تمام تر سامان مہیا ہوتے ہیں گاڑیاں ان کے دروازوں پر کھڑی رہتی ہیں اور مختلف اخراجات کے بہانے سے جن میں فلم بنانا بھی شامل ہے، مالی امداد پہنچائی جاتی ہے۔

اس انجمن کے ذریعے صرف پاکستانی اور ہندوستانی عوام کو ہی دھوکہ نہیں دیا جا رہا بلکہ امریکہ کے عوام کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کے عطیات کچھ لوگوں کی عیاشی میں صرف ہو رہے ہیں جبکہ اس انجمن کا اصلی کام اقوام متحدہ اور امریکی محکمۂ خارجہ کے وسائل سے ہو رہا ہے جو کہ اس انجمن کو اپنے مخصوص مقاصد کے تحت فنڈ مہیا کرتے ہیں۔ امریکی عوام کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ اس انجمن کے نام نہاد امدادی کام کس قدر لاپرواہی اور بدانتظامی کا شکار ہیں قحط کے زمانے میں یہ انجمن ورکشاپ کے اوزار بھیج دیتی ہے اور تپتی ہوئی گرمی میں یہ لوگ اونی سویٹر امداد میں بھیج دیتے ہیں۔

یہ انجمن اپنے آپ کو غیر سیاسی ظاہر کرتی ہے جب کہ بڑی چالاکی سے اس نے امریکہ کے عوام کے سامنے برصغیر کی وہی صورتِ حال پیش کی جو یحییٰ خان پیش کر رہے تھے۔ دوسری طرف اس انجمن نے بھارت اور عوامی لیگ سے بھی اپنے تعلقات درست رکھے "کیر" پہلی انجمن ہے جس کو مجیب حکومت "بنگلہ دیش" میں امدادی کام کرنے کی اجازت دی ہے۔

کراچی میں "کیر" کے سربراہ کو علم تک نہیں کہ اورنگی میں مشرقی پاکستان سے آنے والے مزید غیر بنگالیوں کی امداد کے لیے کوئی پلان موجود ہے۔

کیئر اور اس جیسی دوسری انجمنوں کی برصغیر میں جملہ کارروائیاں اور پالیسیاں درحقیقت بڑی طاقتوں کی ان ممالک کے متعلق پالیسیاں ہیں۔ پسماندہ ممالک کی کلاسوں کو بڑی طاقتوں کی ان کارروائیوں کی کڑی نگرانی کرنی چاہیئے



حسرت موہانی اشتراکی نظامِ معیشت سے متاثر تھے

آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو

اینٹ کا جواب پتھر سے دو

رؤف شیرازی

جدلیاتی مادیت کے اس دَور میں جہاں آج ہر عمل کا ردِّ عمل اور ہر ردِ عمل کا تیسرا عمل کسی نہ کسی سائنسی اور مادی ہیئت میں ظہور پذیر ہے جہاں اس مادی حقیقت کی روشنی میں پہلی اور دوسری عالمی جنگ نے برطانوی سامراج کو پوری طرح یہ احساس دلا دیا تھا کہ ایشیا سے اس کو اپنا بوریا بستر لپیٹنا ہوگا۔ دونوں جنگوں نے اس کی سامراجی جاہ اور سامراجی معیشت کو بُری طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ اور جنوبی ایشیا میں کہیں نہ کہیں اس کا سورج غروب ہوتا ہُوا بھی نظر آ رہا تھا۔ کسی بھی نقطہ زوال سے پہلے کسی بھی قوم اور طاقت کا نقطۂ عروج تک پہنچنا ایک لازمی عمل ہوتا ہے۔ برطانوی سامراجی تاریخ کا دَور اپنے عروج کا بھی دور تھا۔ اسی دَور میں اس قوم کا جنوبی ایشیا میں اپنی جاہ اور جلال کا آخری دَور تھا جیسا کہ ایک دَم توڑتی ہوئی سامراج اپنی فطری موت سے بہت پہلے ایک بار اپنے سارے عوامل اور سارے عناصر کے ساتھ ظلم کے سارے پیمانے توڑ دیتی ہے وہی حال ہندوستان میں اس سامراج کا تھا۔

دوآبے کی زمین نے بڑی فراخدلی کے ساتھ مغربی اثرات کو قبول کر لیا تھا متحدہ ہندوستان کے نوابوں اور رنگیلے شاہوں نے اپنی اپنی جاگیردارانہ ذہنیت کو اس قدر مستحکم کر دیا تھا کہ مغرب کی ساری سیاسی مصلحتیں خود غرضیاں جو کسی بھی صنعتی اور سائنسی دَور کا تقاضا ہُوا کرتی ہیں وہ پوری طرح جلوہ فگن تھیں۔ اس وقت کے پورے دَور کے اخلاقی اور روحانی پیمانے بھی بدل چکے تھے۔ مصنوعی تہذیب کا غلاف ہر ایک پر پوری طرح چڑھا ہُوا تھا۔ سر سیّد اسکول کی یہ ذہنیت کہ آدمی انگریزی پڑھ کر، انگریزی بول کر اور انگریزی لباس پہن کر ہی تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے پورے شباب پر تھی۔ مغربی اقدار کے بہت سے ناسُور ہماری قوم میں پھوٹ چکے تھے۔

انگریزوں نے ہماری صلاحیتوں کو مقید کر کے ہمیں آئی سی ایس (بیورو کریسی) کے دھارے میں بدل دیا تھا۔ ہماری اقدار جھوٹی، ہماری تہذیب مصنوعی اور ساری ہماری سیاسی زندگی انگریز سامراج کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ جاری وساری تھی۔ ہندوؤں کی اکثریت اس بات سے خائف تھی کہ کہیں دوبارہ اورنگ زیب نہ پیدا ہو جائے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات سے خوفزدہ تھی۔ کہ کہیں ہمارے اسلاف کا انتقام ہم سے نہ لیا جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک لامذہب سیاسی جماعت ہونے کے باوجود اکثریتی فرقے کی مذہبی جماعت بن گئی۔ ایک بے اعتمادی نے یقیناً دوسری بے اعتمادی کو جنم دیا۔ ایسے وقت میں علامہ اقبالؒ نے اس سیاسی کشمکش کو محسوس کیا۔ اور متحدہ ہندوستان کے سیاسی اور تہذیبی خلفشار سے متاثر ہو کر اپنی ذات کی اصلاح کی طرف توجہ دی جن کو ہم دوسرے معنوں میں خودی کہتے ہیں۔ اس روّیے سے دو راستے مرتب ہوئے ایک اپنی ذات میں گم ہونے کی خواہش، دوسرے ایک صحت مند نقطۂ نظر سے جزو کو کل کے مقابلہ میں اصلاح پسند بنا دینا۔ کیونکہ جب کبھی کسی معاشرہ کو اچھائی سے روشناس کرانا ہوگا تو اس کی اصلاح دو ہی صورتوں میں ہوگی۔ اول تو وہ ایک ایسا انقلاب لائیں گے جس سے سارا ماحول آنِ واحد میں اجتماعی پابندی کے ساتھ کسی نہ کسی مجوزہ اقدار پر کاربند ہو جائے گا جو اس وقت کے مسلم معاشرے میں ممکن نہ تھا یا پھر فرداً فرداً اس معاشرے کا ہر فرد اپنی اصلاح کسی تاریخی، قومی اور تہذیبی پس منظر میں کرے گا اور اس طرح پھر کوئی ایک مثالی معاشرہ بن جائے گا۔

علامہ اقبالؒ متحدہ ہندوستان کے اسی پس منظر میں مارکس لینن اور اسٹالن سے متاثر ہوئے تھے۔ انسانیت کی فلاح کا جو معاشی اور سیاسی تصوّر ان بزرگانِ انسانیت نے دیا تھا۔ اس سے ہمارے مفکّرِ پاکستان نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے ادب عالیہ کے ایک خاص حصے کو نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کو ہم اقبالیات کا بین الاقوامی ادب کہتے ہیں۔ ادب عالیہ کے اس حصے کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ وقت، فاصلہ اور طوالت کے پیشِ نظر صرف چند شعروں پر اکتفا کر رہا ہوں ——— روسو کے فرانس میں انقلاب آ چکا تھا اور اس کے بعد یہ دنیا بالشویک انقلاب سے بھی واقف ہو چکی تھی۔ کرۂ ارض میں بسنے والے یہ اچھی طرح محسوس کر چکے تھے کہ محنت سے عوام کے

اسلام میں دُنیاوی آسودگی کو پوری اہمیت دی گئی ہے

لیے تاریخ کا ایک نیا باب کھُل چکا ہے۔

لینن خدا کے حضور میں

(آخری چار مصرعے)

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تیری منتظر روزِ مکافات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

"سرمایہ و محنت"

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سُود نہیں رُوس کی یہ گرمیٔ رفتار

"ضربِ کلیم" اشتراکیت

وُہ کلیمِ بے تجلّی ، وہ مسیحؑ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

(کارل مارکس)

وُہ متحدہ ہندوستان کے واحد مسلمان نہیں جنہوں نے شعوری اور فکری انداز سے اسلام کی صحیح جھلک معاشی مساوات کے تعلق سے اشتراکیت کے اصولوں میں دیکھا۔ اس انسانی آسودگی سے متاثر ہوئے اس لیے بھی کہ اسلام میں بہر کیف دنیاوی آسودگی کو کسی اور نامعلوم آسودگی سے کم غیر اہم نہیں کہا گیا۔ اس کے بعد کے دَور میں مولانا حسرت موہانی کی فکر اور دنیاوی آسودگی علامہ اقبالؒ کی فکر سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ دونوں بڑی حد تک سماجی انصاف، دنیاوی آسودگی، معاشی مساوات اور اشتراکی انقلابی رجحانات کے تعلق سے ایک ساتھ بہت دُور تک چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان فکری رجحانات سے وہ کیسے الگ رہ سکتے تھے؟

مسلمانوں کا جب جنوبی ایشیا میں استحصالی ہندو سامراج کے غیر صحت مند اور غیر ترقی پسند مزاج سے ٹکراؤ ہُوا تو دونوں طرف کی سیاسی طاقتوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانا اور پرکھا۔ اس وقت صرف ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ اب اُسی شدت سے اس کا مقابلہ کیا جاتا اور استحصالی ہندو سامراج جو بلاشبہ برطانوی سامراج ہی کا ایک حصہ تھا ان کا اس قوّت سے تصادم ہُوا۔

۱۹۲۱ء میں مولانا حسرت موہانی مسلمانوں کی مکمل نمائندگی کرتے ہوئے احمد آباد کے آل انڈیا نیشنل کانگرس" میں اعلان کرتے ہیں۔ "ہم آزادی چاہتے ہیں اور صرف مکمل آزادی ——!" یہ وہی نیشنل کانگرس ہے جس کی بنیاد برطانوی سامراج نے اپنے سامراجی مقاصد کو جمہوری شکل دینے کے لیے ڈالی تھی۔ برطانوی حکومت نے متحدہ ہندوستان پر اپنے استحصالی تسلّط کو مزید چند سالوں تک زندہ رکھنے کے لیے انتہائی ذہانت کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں سیاسی جماعتوں کے وجود کو تسلیم کیا اور ساتھ ساتھ سیاسی جوڑ توڑ بھی شروع کر دی۔ بظاہر ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس ملک میں بیسویں صدی کے جمہوری نظام کو تسلیم کرتے ہوئے عوام کو زیادہ سے زیادہ سیاسی جمہوری اور علاقائی خود مختاریاں دی جائیں لیکن اس کے پسِ پردہ وہ سمجھ چکے تھے کہ نو آبادیاتی اقتدار ایک نہ ایک دن انہیں چھوڑنا پڑے گا۔ اس وقت مولانا حسرت موہانی مکمل حق خود اختیاری یا مکمل آزادی کا نعرہ لگاتے ہیں جب ہندوستان کے چوٹی کے ہندو مسلم سیاست داں، سیاسی تقاضوں کے تحت بتدریج آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت کا ہر سیاستدان برطانوی وائسرائے اور با اختیار برطانوی گھرانوں کے زیرِ اثر اپنے سیاسی اثرات کو عوام پر مسلّط کر رہا تھا ان حالات میں مولانا حسرت نے ان الفاظ میں اعلان کیا

"ہم اس وقت تک آزادی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہ کر لیں۔ ہمیں تشدّد کا جواب تشدّد سے دینا چاہیئے۔ پولیس ہو یا فوج، ہمیں اس کے مقابلے میں ڈٹ جانا چاہیئے۔ انگریز اگر ہمارے سَو آدمیوں کو ہلاک کریں گے تو غیر مسلح ہونے کے باوجود ہم بھی دس انگریزوں کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے سو آدمیوں کی ہلاکت کو قربانی سمجھ کر اور زیادہ جوش و خروش سے میدان میں اتریں گے اور وہ اپنے دس آدمیوں کی ہلاکت کو قتل تصور کریں گے اور سراسیمہ ہو جائیں گے۔ آزادی بڑی سے بڑی قیمت مانگتی ہے اور ہم یہ قربانی دینے کا تہیّہ کر چکے ہیں۔ ہم توپ کا جواب تفنگ سے دیں گے اس وقت تک میدان نہیں چھوڑیں گے جب تک انگریز اس ملک سے رخصت نہ ہو جائے۔"

مولانا کی تحریروں میں
کروڑوں عوام کا کرب
اور معاشی بے چینی
نظر آتی ہے

یہ دراصل جواب تھا اس برطانوی استبدادیت کا جو اس دَور میں روا تھی۔ مولانا بھی اس کے شکار تھے۔ مولانا کا جس طبقے سے تعلق تھا وہ بھی اس ظلم و تشدّد کا براہ راست شکار تھا۔ دوسری طرف اس وقت کی با اقتدار قیادت کے مفادات اور تھے۔ بڑے بڑے ہندو اور مسلمان بڑی بڑی جاگیروں، کارخانوں اور دکانوں کے مالک تھے۔ ان کی سوچ تھی کہ آزادی مختلف درجوں سے اور مختلف خانوں سے تقسیم ہو کر انہیں ملے گی۔ اس قسم کی آزادی کا پلان تاجِ برطانیہ نے بہت پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ تاجِ برطانیہ نے انہی سائنسی اور تکنیکی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اتنی طویل مدّت تک اس سرزمین پر اپنا تسلّط قائم رکھا۔

مولانا کی نثر میں آپ کو متحدہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کا کرب اور ان کی سیاسی اور معاشی بے چینی نظر آئے گی۔ وہ عام مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی تقاضوں کو سمجھتے تھے اور معاشی مساوات کو اشتراکیت کی روشنی میں اپنے اسلامی تہذیبی و تمدنی رشتوں کے ساتھ اپنانا چاہتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی سوویت رُوس کے معاشی نظام سے اس قدر متاثر تھے کہ انہیں یہ کہنا پڑا کہ



ہم آزادی چاہتے ہیں - مکمل آزادی

اس وقت کے تقاضے کے تحت چند اشعار سپردِ قلم ہیں، جس میں آپ مولانا کی جدت پسندی، ترقی پسندی اور نئے ہندوستان کے اشتراکی رجحانات کو تلاش کر سکتے ہیں۔ سے

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے حد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

سوویت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرتؔ کی غزل خوانی نہیں جاتی

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا، اہلِ سوویت نے
دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوف و دین ہو کر

روح آزاد ہے، خیال آزاد
جسمِ حسرتؔ کی قید ہے بے کار

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیِ ضمیر میں، عقل سے اجتہاد کر

علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں جدت کے سوا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شانِ فراغت تھی راحت کے سوا

سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں، کیوں نہ ہوں
معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرتؔ کے سوا

روح کو محوِ جمالِ رخِ جاناں کر لیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں

کیا حسن پرستی بھی کوئی عیب ہے حسرتؔ
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

میرا خیال ہے کہ مولانا پہلے دو تین اشعار میں سوویت انقلاب اور سوویت نظام سے اپنی ساری اردو شاعری کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہیں۔ جب انہوں نے سوویت نظام پر مشتمل یہ اشعار پہلی بار لکھنؤ کی ایک ادبی نشست میں سنائے تو لوگ حیران تھے کہ یہ کیا نیا انقلاب مولانا کی زندگی میں آ رہا ہے۔ "سوویت" لفظ پر انہوں نے پندرہ منٹ تقریر کی اور کہا کہ یہ "سوویت" لفظ عربی سے ماخذ ہے۔ عربی زبان میں "سوویت" کو مساوات کے معنوں میں سمجھا جاتا ہے۔

اس مردِ مجاہد نے ایک وقت میں دو استحصالی قوتوں کو للکارا تھا۔ ایک برطانوی حکومت کو اور ساتھ ہی ملکی سامراجی قوتوں کو! اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ کتنے بڑے اپنے دور کے انقلابی تھے بنیادی طور پر مولانا حسرتؔ چونکہ شاعر تھے اور شاعری کا نشہ کسی اور نشہ سے بہر صورت کم نہیں ہوتا، وہ اس کے عادی تھے۔ اپنے دکھوں کو اپنے ہی شعروں میں گھولتے تھے اور غم ہلکا کرتے تھے۔ اس لیے انسان کو کسی نہ کسی طور پر ایک ایسا روزن تو چاہیے جس سے غم اور دکھ درد آ جا سکے۔ اور اس پر تماشہ یہ کہ وہ صوفی شاعری سے بھی متعلق تھے۔ فرنگی محلی نظریۂ تصوف سے وابستہ رہے تو اس رشتے سے انسانیت عالمی بھائی چارگی، مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی جن کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل سے ہو یہ ان کا شعار تھا۔ صوفیانہ شاعری کی کوئی افادیت ہو یا نہ ہو میرے نزدیک ان کی انسانیت نوازی، دکھوں سے رشتہ ان کے سارے رشتوں پر بھاری ہے۔ اس شاعری میں اس وجہ سے اثر ہے کیونکہ اس کا تعلق عالمی دکھ اور عالمی آسودگی سے بھی ہے۔ انسان ان کے نزدیک سب سے اہم ہے اور انسان ایک اشتراکی کے نزدیک سب سے عظیم ہے۔ وجود کے تصور ہی نے شعور کو جنم دیا۔ انسانی شعور نے ہی دنیا کی ساری معلوم اور نامعلوم طاقتوں کو دریافت کر لیا ہے۔ ان ہی طاقتوں میں سے ایک طاقت خدا کی بھی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مولانا وقفِ واحد میں پہلے بہت بڑے انسان تھے، مسلمان تھے، ہندوستانی تھے اور ساتھ ساتھ مسلم لیگی تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے اہم رکن تھے اس طرح جب اسلام اور اشتراکیت کے درمیان جو خطِ اتصال کھینچ لی جائے گی وہی اسلامی اشتراکیت ہو گی۔ آج جب ہم دوسرے مغربی اثرات قبول کر سکتے ہیں تو اشتراکیت اور اسلام کے ملے جلے اثرات پر مشتمل کوئی راہ ہم کیوں متعین نہیں کر سکتے؟ ہم جب ذہنی اور معاشی طور پر سرسید اسکول سے وابستہ ہو سکتے ہیں، ہم جب مسلم لیگ کی بے دین سیاست کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ہم جب پاکستان بن جانے کے بعد امریکی اور برطانوی طرزِ زندگی اختیار کر کے ان کی معیشت اور اخلاق کو اپنا کر ترقی یافتہ قوم بن جانے کا صداقت نامہ لے سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم تہذیبی انداز سے مسلمان رہتے ہوئے اشتراکی معیشت کو نہ اپنا سکیں۔

مولانا حسرتؔ موہانی بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان جب مسلمان رہ کر برطانوی معیشت کے غیر اسلامی اصولوں پر عمل کر سکتا ہے۔ ان کے بینکنگ اور انشورنس کے غیر اسلامی ڈھانچوں پر کھڑا ہو سکتا تو وہ مسلمان رہ کر کیوں اشتراکی معیشت پر عمل نہیں کر سکتا؟ جبکہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی کو متاثر کیے بغیر دنیاوی آسودگی ہمیں دے سکتی ہے۔

مولانا حسرتؔ سب سے پہلے ہندوستان کے اشتراکی مسلمان ہیں۔ "اردوئے معلیٰ" کے مدیر تھے اور پھر نئی غزل کے محبوب غزل گو، جس کا محبوب دجلہ و فرات، سمرقند و بخارا، کوہ قاف اور شیراز کی بجائے وادیٔ ہمالیہ کے دامن میں پناہ گزین تھا۔

کراچی پولیس کا لاٹھی چارج

علاقہ مجسٹریٹ نے کہا: مارو...

شوکت صدّیقی

۱۰ مئی کا دن تاریخ پاکستان کا سیاہ ترین دن تھا۔

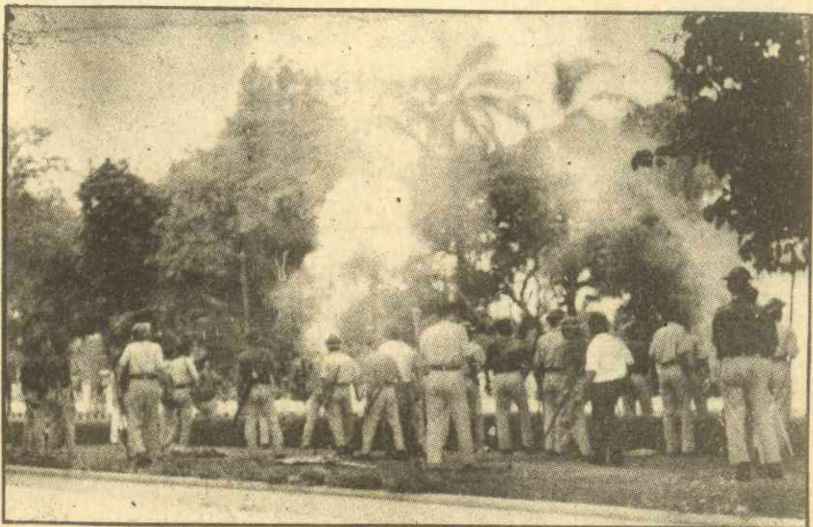
اس روز آفتاب غروب ہوا تو پاکستان سے علم و دانش ادب و صحافت، تہذیب و ثقافت، قلم اور موئے قلم کی حرمت کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ نہتے دانش وروں پر، مفکروں پر، ادیبوں پر، صحافیوں پر، اساتذہ پر، طلبہ پر، فنکاروں اور محنت کشوں پر پولیس کی لاٹھیاں برس رہی تھیں، نہ بوڑھے کی تمیز تھی، نہ بچے کی، نہ عورت کی تمیز تھی، نہ بیمار اور اپاہج کی۔ چیخیں ابھرتی رہیں۔ فریاد کرنے والی زبانیں فریادیں کرتی رہیں اور لاٹھیاں برستی رہیں۔ آنسو گیس کے گولے پھٹتے رہے۔

یہ ظلم و تشدد کس جرم کی پاداش میں ہوا؟ وہ ویت نام کے مظلوم عوام پر امریکی قتل و غارت گری کے خلاف احتجاج کرنے نکلے تھے۔ وہ امریکی قونصل خانے کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ امریکی جارحیت کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن امریکی قونصل خانے کا وقار ادب و ثقافت، فن اور صحافت سے زیادہ بلند و بالا ہے۔ اس کا تحفظ دانش وروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فن کاروں، اساتذہ اور طلباء سے زیادہ گراں مایہ ہے۔ لہٰذا امریکی قونصل خانے کے وقار پر آنچ نہیں آنے دی گئی۔ اس کے روبرو احتجاج کرنے کا صلہ لاٹھیوں، گالیوں اور آنسو گیس کے دھماکوں سے دیا گیا۔ ویت نام میں پُرامن شہریوں پر بم برستے تھے اور کراچی میں مظلوموں کی حمایت کرنے والوں پر لاٹھیاں برستی تھیں۔

آغاز اس داستان خونچکاں کا اس طرح ہوا کہ کراچی کے دانش وروں، اساتذہ، فن کاروں، ادیبوں، صحافیوں، طلباء اور محنت کشوں کی پندرہ تنظیموں نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۰ مئی کو "یوم ویت نام" منایا جائے۔ پروگرام یہ تھا کہ سہ پہر کو صدر میں اجتماع ہو، پھر جلوس نکالا جائے۔ یہ جلوس عبداللہ ہارون روڈ سے گزرتا ہوا امریکی قونصل خانے پہنچے۔ وہاں ذرا دیر پرامن مظاہرہ کیا جائے۔ اس کے بعد باغ جناح سے گزرنے والی شاہراہ عبور کر کے پریس کلب پر ختم ہو جائے۔ کوشش کی گئی کہ جلوس اور مظاہرہ پُرامن ہو۔ اشتعال انگیز نعرے نہ لگائے جائیں۔ توڑ پھوڑ سے اجتناب کیا جائے۔ مقصد امریکی جارحیت کے خلاف احتجاج اور ویت نام کے حریت پسندوں کی حمایت کا اظہار تھا۔

مظاہرے سے چند روز قبل تمام متعلقہ جماعتوں کے نمائندوں کا جلسہ ہوا۔ اس میں تمام تفصیلات طے کی گئیں۔ دوسرے روز میں اور منہاج برنا کراچی کے ڈپٹی کمشنر کنور ادریس سے ملے۔ مظاہرہ کرنا اور جلوس نکالنا ہمارا جمہوری حق تھا۔ نیت بری نہ تھی۔ مقصد نیک تھا۔ یہ ملاقات ہم نے احتیاطاً کی تھی کہ ڈپٹی کمشنر کو صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ انہوں نے امریکی قونصل خانے کے سامنے مظاہرہ کرنے پر اعتراض کیا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ یہ جلوس ایسی تنظیموں کی سربراہی میں نکالا جا رہا ہے جو اپنے جمہوری حقوق کے ساتھ اپنے جمہوری وظائف سے بھی آگاہ ہیں۔ ان میں ایسے لوگ شامل ہیں جو کسی قوم کا ذہنی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی حجت کے بعد ڈپٹی کمشنر نیم رضامند ہو گئے۔

اسی روز سندھ کے وزیر اعلیٰ جناب ممتاز بھٹو کی پریس کانفرنس تھی۔ کانفرنس ختم ہوئی تو برنا صاحب نے ان سے جلوس اور مظاہرے کا ذکر کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ڈپٹی کمشنر سے بات کر لیں گے۔



...ماؤں کو



تصاویر : ظفر نثار

...لیس ڈی ایم کو
...مریکی قونصل خانے
...کے شیشے عظیم
...صحافیوں اور
...دانشوروں کے
...سروں سے زیادہ
...پیارے تھے"

ساتھ ہی مسکرا کر بڑی بے تکلفی سے بولے۔

"بڑا مزا آئے گا۔ جب صحافیوں اور ادیبوں

پر لاٹھی چارج ہوگا۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ ہم نے مطمئن ہو کر انتظامات شروع کر دیئے۔ آرٹسٹوں نے رات رات بھر جاگ کر بینر تیار کئے۔ رنگا رنگ پلے کارڈ بنائے۔ ہم اُسے ہر طرح ایک پُروقار، پُرامن اور مؤثر مظاہرہ بنانا چاہتے تھے۔

جلوس نکالنے سے ایک روز قبل تمام تنظیموں کے نمائندوں کا پھر جلسہ ہوا۔ اس میں ڈپٹی کمشنر اور وزیر اعلیٰ کے ساتھ گفت و شنید کی تمام تفصیلات بتائی گئیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ڈپٹی کمشنر نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ کچھ لوگ جلوس میں گڑبڑ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ ۰۰ رضا کار کئے جائیں جو جلوس کی تنظیم کی نگہداشت کریں اور جن لوگوں سے کسی قسم کی اشتعال انگیزی کا خطرہ ہو ان پر کڑی نگاہ رکھیں۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جلوس کو ایک جیپ کے ذریعے کنٹرول کیا جائے، جس پر لاؤڈ اسپیکر نصب ہو اور اس سے مناسب ہدایات جاری کی جائیں۔ یہ تمام تفصیلات اور انتظامات طے کرنے کے بعد ہر متعلقہ جماعت اور تنظیم نے اپنی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔

---

۲۰ مئی کو ۳ بجے سے لوگ صدر میں اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں صحافی تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، پروفیسر تھے، ماہرینِ تعلیم تھے، ماہرینِ قانون تھے۔ مفکر تھے، دانشور تھے، طلباء تھے، مزدور تھے۔ پانچ بجتے بجتے اجتماع ہزاروں تک پہنچ گیا۔ ہر طرف سُرخ جھنڈے لہراتے تھے۔ طرح طرح کے بینر اور کتبے (پلے کارڈ) نظر آتے تھے۔ کہیں ابراہیم جلیس بینر تھامے کھڑے تھے۔ کسی پلے کارڈ کے سائے میں سیّد محمد تقی تھے۔ کہیں شفیع عقیل تھے۔ کہیں حمید کاشمیری اور سرشار صدیقی تھے۔ کسی نکڑ پر جون ایلیا تھے۔ کہیں محبوب جمال زاہدی اور منہاج برنا تھے۔ کہیں پروفیسر عتیق احمد اور رشید بٹیل تھے۔ رشید حسن خاں تھے، کرامت علی تھے۔ ادیب تھے، صحافی تھے، اساتذہ اور طلباء تھے، محنت کش تھے۔ سب ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر مبارک باد دیتے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع تھا۔ ہر طرف نعرے گونجتے تھے۔ جھنڈے ہوا سے پھڑپھڑاتے تھے۔

بعض تنظیموں کے رہنماؤں نے اجتماع سے خطاب کیا۔ جون ایلیا اور دوسرے شعراء نے ویت نام پر اپنی نظمیں سنائیں امریکی جارحیت کی مذمت اور ویت نامی حریت پسندوں کی حمایت میں ایک قرارداد پڑھ کر سنائی گئی، جسے متفقہ طور پر منظور کر کیا گیا۔

چھ بجے شام کے قریب جلوس روانہ ہوا۔ سب سے آگے ہوچی منہہ کی ایک بڑی سی تصویر تھی۔ اس کے پیچھے ویت نامی حریت پسندوں کا انقلابی پرچم تھا۔ ان کے پیچھے ایک گاڑی میں جامعہ کراچی کے طالب علم آغا تھے جو پیروں سے معذور ہیں۔ ایک طالب علم ان کی گاڑی چلاتا تھا۔ پھر پوری ایک صف متعلقہ تنظیموں کے رہنماؤں کی جلوس کے آگے آگے چلتی تھی۔ پیچھے دور تک جلوس پھیلا تھا۔ ۱۶ مئی کے جلوس کے مقابلے میں اس دفعہ مزدوروں کی تعداد کم تھی۔ بڑی تعداد دانش وروں، صحافیوں اساتذہ، طلباء اور اہلِ قلم کی تھی۔

جلوس میں کچھ چہرے ایسے بھی خاصی تعداد میں نظر آئے جو عرصہ بعد دیکھنے میں آئے۔ یہ سی۔آئی۔ڈی کے لوگ تھے۔ جب تک صدر میں مظاہرہ ہوتا رہا۔ یہ لوگوں کے نام اور بینروں اور کتبوں کی عبارتیں نوٹ کرتے رہے۔ انہیں دیکھ کر غلام محمد اور اسکندر مرزا کا دور یاد آیا، ایوب خاں اور یحییٰ خاں کا عہدِ یاد آیا۔ جمہوریت کا ڈھونگ یاد آیا۔ مارشل لاء کا قہر یاد آیا۔ وہ زمانہ یاد آیا جب پاکستان میں بغداد پیکٹ میں اور اس کے انتقال پُرملال کے بعد سیٹو اور سنٹو میں شامل ہوا جب ایڈن ہاورنے پاکستان کا دورہ کیا اور تھوک کے حساب سے صحافیوں ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئیں۔

غرضیکہ جلوس نہایت وقار اور پُرامن طور پر آگے بڑھتا رہا۔ کہیں سے کوئی قابلِ اعتراض نعرہ بلند کیا جاتا تو میں خود جا کر منع کرتا۔ کراچی یونین آف جرنلسٹس کے حمید چھاپرہ اور دوسرے ذمہ دار کارکن اور رضا کار ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے جلوس کو منظم کرتے تھے۔ لوگوں کو اشتعال انگیزی سے روکتے تھے۔

جب جلوس ہوٹل میٹروپول کے قریب پہنچا تو مجھے آگے کی صف میں بلا لیا گیا۔ اب امریکی قونصل خانے کی عالیشان عمارت قریب آگئی تھی۔ دُور سے پولیس کے مسلّح دستے سڑک کے دونوں جانب ایستادہ نظر آئے، جلوس قریب پہنچا، قریب، اور قریب نعرے تیز تر ہو گئے۔ پولیس والے آگے بڑھے اور راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا۔ ڈپٹی کمشنر کو اور پولیس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ جلوس قونصل خانے کے سامنے جا کر مظاہرہ کرے گا۔ نکسن کا پتلا جلائے گا۔ اس

کراچی انتظامیہ نے انسانیت کا مفہوم بدل ڈالا

کے بعد جلوس باغ جناح کا چکر کاٹ کر پرنس روڈ کے راستے سے پریس کلب پہنچ جائے گا۔

پولیس کی یہ رکاوٹ دیکھ کر جلوس کا مشتعل ہونا ایک فطری امر تھا۔ نہ اس علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی، نہ یہ علاقہ ممنوعہ ہے یہ عوام کے جمہوری حقوق میں کھلی مداخلت تھی۔ یوں بھی جلوس کا قونصل خانے کے سامنے سے گزرنا اور مظاہرہ کرنا نئی بات نہ تھی۔ انہی روز راولپنڈی میں امریکی سنٹر کے سامنے مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اس سے قبل بھی مظاہرہ ہو چکا تھا بلکہ ویت نام کے حریت پسندوں کا پرچم امریکی سنٹر پر لہرایا جا چکا تھا۔ لاہور میں بھی ایسا ہی مظاہرہ ہو چکا تھا، نہ پولیس نے روکا نہ مداخلت کی۔

امریکی جارحیت کے خلاف مظاہرے نئی بات نہیں۔ دنیا بھر کے ملکوں میں ایسے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ خود امریکہ میں طلبہ آئے دن ویت نام کے حریت پسندوں کی حمایت میں مظاہرے کر رہے ہیں۔ کراچی میں ایسا کیوں ہوا؟ اس کا نہ کوئی قانونی جواز تھا، نہ اخلاقی نہ سیاسی، نہ معاشرتی۔ یہ آزادیٔ اظہار پر پہرے بٹھانا تھا۔ یہ جمہوریت کی پامالی تھی۔

جلوس کی منتظم جماعتوں کے رہنما سوچ ہی رہے تھے کہ اس اچانک صورت حال کے بارے میں کیا طے کیا جائے۔ اس اثنا میں وہ لوگ، جو ہوچی منہہ کی تصویر اٹھائے ہوئے تھے بغیر ٹھہرے آگے بڑھے اور پولیس کا حلقہ توڑ دیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ جلوس کا اگلا حصہ تھا جو سو، دو سو افراد پر مشتمل تھا۔ جلوس کا بہت بڑا حصہ ہنوز سو، سوا سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ آگے کیا ہو رہا ہے۔

نعرے اب ہر طرف گونج رہے تھے۔ کچھ نوجوان مشتعل ہو کر قونصل خانے کی عمارت کی طرف بڑھے۔ پولیس نے ان کو دھکیل کر روکنا چاہا۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچا۔ میرے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے کنوینر رفیق چودھری بھی پہنچے۔ وہ طلباء کو سمجھاتے تھے۔ پولیس والوں کو مارنے سے روکتے تھے۔ چند پولیس والوں نے انہیں گھسیٹ کرلے جانا چاہا۔ میں نے انہیں پولیس والوں کی گرفت سے آزاد کرایا۔ اسی وقت ڈپٹی کمشنر کنور ادریس آ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ پولیس کو اشتعال انگیزی سے باز رکھیں۔ میں طلباء کو سنبھال لوں گا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھتے ہوئے طلباء کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی وقت پیچھے سے کسی ظالم نے لاٹھی کا کندھے پر ایسا وار کیا کہ بازو جھول گیا۔ اس کے ساتھ ہی رفیق چودھری پر چاروں طرف سے لاٹھیاں برسنے لگیں۔

میں نے پلٹ کر پولیس والوں کی جانب دیکھا خدا گواہ ہے وہ قانون کے محافظوں کے چہرے نہ تھے۔ وہ انسانوں کے بھی چہرے نہ تھے۔ وہ قاتلوں سے زیادہ بے رحم اور ظالموں سے زیادہ ظالم چہرے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے سلطنتِ روم کے وہ چیتے اور شیر یاد آ گئے جنہیں کئی کئی روز بھوکا رکھا جاتا اور پھر امراء کی تفریح کے لئے موت کی سزا پانے والے قیدیوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ انہیں چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ اِن آنکھوں میں وہی چمک تھی وہی سرخی تھی۔ وہی غیض و غضب تھا۔ میں انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

طلباء کا مشتعل ہجوم وہاں سے ہٹ کر دوسری جانب بڑھا۔ وہ قونصل خانے کی عمارت کے بیرونی دروازے کے

اس ظلم پر
خود پولیس والوں کا
ایک حِصّہ
تڑپ اُٹھا

سامنے والے لان پر پہنچ چکے تھے۔ میں تیزی سے اس جانب بڑھا۔ اسی وقت میری نظر علاقہ مجسٹریٹ سالک نذیر پر پڑی۔ ان کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے غصّے سے چیخ کر کہا۔ ”مارو سالوں کو!“ کہنے کی دیر تھی اور سالوں پر پولیس کی لاٹھیاں برسنے لگیں۔ ان میں طلباء بھی تھے، اساتذہ بھی تھے، ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ ہر امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ ہر احتیاط اٹھ چکی تھی

میں سوچ رہا تھا کہ مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے مجسٹریٹ صاحب پہلے لاؤڈ اسپیکر سے وارننگ دیں گے۔ جب وہ منتشر نہ ہوں گے تو لاٹھی چارج کا حکم صادر فرمائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ایک بار جب پولیس کی لاٹھیاں حرکت میں آئیں تو اندھا دھند چلنے لگیں۔ ان کی زد سے نہ طالبات بچیں، نہ اسکول کی استانیاں نہ صحافی بچے، نہ ادیب، نہ مفکر، نہ دانش ور۔ جامعہ کراچی کے معذور طالب علم آغا بیچ سڑک پر اپنی گاڑی میں لاچار اور مجبور بیٹھے تھے۔ جو طالب علم ان کی گاڑی سنبھالے تھا، وہ بھی پٹا، لاٹھیاں گاڑی پر بھی پڑیں اور ان پر بھی۔ لاٹھیاں ابراہیم جلیس پر بھی پڑ رہی تھیں۔ منہاج برنا پر بھی اور جون ایلیا پر بھی

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔

ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ زخم کھانے والے تڑپتے تھے۔ تکلیف سے بلبلاتے تھے۔ اور لاٹھیاں برستی تھیں۔ نہتے لوگ زخمی ہو ہو کر گرتے تھے۔ پولیس کے کانسٹیبل انہیں فرش پر گھسیٹتے تھے۔ جوتوں سے جسموں کو روندتے تھے۔ ٹھوکریں مارتے تھے۔ غلیظ گالیاں بکتے تھے۔ ماؤں اور بیٹیوں کی عزّت کو سر بازار سولی پر چڑھاتے تھے۔ وہ جسے دیکھتے تھے۔ خونخوار درندے کی طرح اس پر جھپٹتے تھے۔ انسانیت مر چکی تھی۔ ہمدردی ترس رحم دلی سارے جذبے دم توڑ چکے تھے۔ وہ اتنے خونخوار کیوں ہو گئے تھے۔ اتنے غضب ناک کیوں ہو گئے تھے۔ دیوانے کیوں ہو گئے تھے۔ کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ صرف چند طالب علموں نے یہ جسارت کی تھی کہ قونصل خانے کے لان کی نرم گھاس کو روند ڈالا تھا۔ وہ صرف امریکہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ایک صحافی نے ویت نام کے حریت پسندوں کا جھنڈا لگانے کی کوشش کی تھی۔ جھنڈا لگ جاتا تو کیا غضب ہو جاتا۔ راولپنڈی میں بھی تو لگا تھا۔ قیامت تو نہ آ جاتی۔ ہمیں مہلت تو دی ہوتی۔ ہم نے وعدہ کیا تھا تو ہم ان پر قابو بھی پا لیتے۔ وہ غیر نہیں تھے۔ ان میں میرے بچے تھے۔ میری طرح دوسروں کے لختِ جگر بھی تھے۔ وہ اسی قوم کے فرزند تھے۔ یہی وہی نوجوان تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کے حق میں جلسے کئے تھے۔ جلوس نکالے تھے۔ مظاہرے کئے تھے۔ نعرے لگاتے تھے۔ اس کے صلے میں پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔ جیلیں کاٹی تھیں۔

ویسے بھی یہ جلوس جن لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ وہی صحافی تھے۔ جنہوں نے پیپلز پارٹی کی خاطر اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھوئے اور کئی سال تک بے روزگاری اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کی۔ یہ وہی اہلِ قلم تھے، جنہوں نے اس ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایک سیاسی جماعت کیلئے اپنی تحریروں کو وقف کر دیا تھا۔ اور وہ سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔ اور اسی پیپلز پارٹی کی حکومت میں ان پر ناکردہ گناہ —— لاٹھیاں برسائی

پیپلز پارٹی کی

حکومت میں بھی

امریکی سامراج کی

مخالفت جرم ہے



جارہی تھیں۔ ظلم وتشدد ہورہا تھا۔ کیا امریکی سامراج کی مخالفت اتنا بڑا جرم ہے؟

یہ ایسا ظلم تھا کہ خود پولیس والوں کا ایک حصہ تڑپ اٹھا۔ ایک پولیس انسپکٹر نے ایک طالبہ کو بُری طرح مارنے پر ایک کانسٹیبل کو روکنا چاہا تو اُس نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور پلٹ کر لاٹھی کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ صرف یہی نہیں۔ اس کے بعد ان آنکھوں نے پولیس والوں کو پولیس والوں پر لاٹھیاں برساتے دیکھا۔ جتنے پولیس والے زخمی بتائے جاتے ہیں، اسی تصادم میں زخمی ہوئے۔ جلوس والے تو بالکل نہتے تھے۔ ان کے پاس نہ پتھر تھے، نہ ڈنڈے۔ سڑک پہلے سے صاف کر دی گئی ہے اور باغ جناح کے سبزہ زار پتھروں کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پتھر تو خود میں نے دیکھے کہ پولیس کے دستے کے پیچھے اکٹھے تھے۔ جنہیں پولیس والے بھاگتے ہوئے لوگوں پر پتھراؤ کرتے تھے۔

اس تمام ہنگامے میں مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے۔ میں لاٹھیوں سے بچتا بچاتا سڑک کے دوسرے کنارے پر آگیا۔ ریلنگ پھاند کر باغ جناح کے اندر گیا۔ ایک جھنڈا ریلنگ کے سہارے پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو ایک پولیس والے نے لاٹھی کا وار کیا۔ سر بچ گیا۔ ورنہ وہیں کام تمام ہو جاتا۔ اسی وقت آنسو گیس کے گولے پھٹنے لگے۔ میرا منجھلا بیٹا قریب آیا۔ بولا "ابو، چلیئے!" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ پیچھے دیکھا تو پولیس والے خونخوار نظروں سے گھورتے تھے۔ لاٹھیاں لئے ہوئے جھپٹتے تھے۔ آگے کا حال یہ تھا کہ دور دور تک آنسو گیس کے گولے پھٹتے تھے۔ ان کا دھواں چاروں طرف پھیلتا جارہا تھا۔ ایک گولہ قریب آکر پھٹا۔ دھواں اٹھا تو دم گھٹنے لگا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ ان سے پانی بہنے لگا۔

پولیس والے باغ کے اندر گھس آئے تھے اور ہر شخص پر لاٹھیاں برسانے لگے۔ پٹنے والوں میں ایسے بھی تھے جو باغ میں شام کے وقت تفریح کے لئے آئے تھے۔ کوئی پولیس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہا۔ میں کسی نہ کسی طرح خاردار جنگلہ پھاند کر باغ کے ایک حصے میں پہنچا۔ سامنے سڑک پر روزنامہ "سن" کی نزہت امین پر پولیس لاٹھیاں برسا رہی تھی۔ ان کی چیخیں ابھریں تو دو بچے مدد کو آئے۔ وہ بھی مار کھا کر زخمی ہو گئے۔ دو صحافی عابد علی سید اور مسعود اللہ ان کی مدد کو پہنچے تو ان پر بھی لاٹھیاں برسنے لگیں۔ چیخیں ابھرتی تھیں۔ دل تڑپتا تھا۔

پولیس کے کانسٹیبل تاتاریوں کی طرح اپنی راہ میں آنے والے ہر شخص پر لاٹھیاں برساتے، پیروں سے روندتے باغ جناح کی دوسری سڑک پر جا پہنچے۔ یہاں بھی جو نظر آیا وہ ان کے تشدد سے نہ بچا۔ کچھ لوگ مسجد میں چھپے، وہ پٹرول پمپ والے کی مخبری پر پولیس کے نرغے میں آئے۔ مسجد سے باہر نکالے گئے اور لاٹھیوں سے اس طرح پیٹے گئے، جیسے روئی دھنکتے ہیں۔ خدایا! اس طرح تو آوارہ کتوں کو بھی نہیں مارتے۔

امریکی قونصل خانے کے اطراف کا کئی میل کا علاقہ پولیس کے محاصرے میں تھا۔ چپے چپے پر پولیس کے دستے تعینات ان میں بڑی تعداد ریزرو فورس کی تھی۔ جسے خاص طور پر پیپری کے کیمپ سے بلایا گیا تھا۔ یہ فسادات پر قابو پانے والی خصوصی پولیس تھی۔ وہ لاٹھیوں سے مسلح تھی۔ اُن کے پاس آنسو گیس تھی سنا ہے اُن کے پاس رائفلوں اور اسٹین گنوں کا بھی ذخیرہ تھا۔ کیا ادیب، صحافی، اساتذہ اور دانشور فسادی ہوتے ہیں شورہ پشت ہوتے ہیں۔ لٹیرے اور شورش پسند ہوتے ہیں۔ دنیا کی کسی لغت نے، کسی فرہنگ نے، کسی تفسیر نے ان کے بارے میں ایسا مفہوم نہیں بتایا۔ کراچی کی انتظامیہ کی لغت نے تو انسانیت کے مفہوم تک بدل ڈالے۔

ہنگامہ صرف یہیں ختم نہ ہوا۔ لٹا ہوا کارواں پریس کلب پہنچا تو پولیس والے وہاں بھی نمودار ہوئے۔ جلوس کے ممبر اپنے جھنڈے اٹھائے جاتے تھے۔ کسی نے ٹوکا تو لاٹھیاں سنبھال کر ٹوٹ پڑے۔ پتھراؤ شروع کر دیا۔ ایک شیشہ توڑ دیا۔

سات طالب علم پولیس کے ہتھے چڑھے۔ وہ حوالات میں بند ہوئے۔ انہیں بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ ان کی رہائی کے لئے بعض تنظیموں کے نمائندے ڈپٹی کمشنر سے ملے۔ میں بھی ان کے دربار میں پہنچا۔ بات چیت ہوئی، معلوم ہوا کہ پولیس کو سب سے زیادہ غصہ اس نعرے پر آیا کہ بعض طلبا۔ یہ نعرے لگاتے تھے۔

"امریکی کتے ہائے ہائے۔"

نعرے لگانے والوں نے غضب کیا۔ امریکیوں کو کتا کہہ دیا۔ آخر اس کا صلہ پایا۔ امریکہ ہمیں امداد دیتا ہے۔ اسلحہ دیتا ہے۔ جب مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوجیں بھارتیوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہیں تو خلیج بنگال میں اپنا بحری بیڑہ دھونس ڈالنے کے لئے لے آتا ہے۔ یہ ہماری قوم پر کم احسان ہے۔ ویت نام میں اس کی بربریت اور بہیمیت کے خلاف احتجاج کرنا احسان ناشناسی ہے، سزا اس کی کڑی ہے۔ ؎

متاعِ لوح و قلم لٹ گئی تو کیا غم ہے۔

صفدر سلیم سیال

غزل

سکوتِ شام کو توڑو، لبوں کو جنبش دو
زمانہ گوش بر آواز ہے اِدھر دیکھو

یہاں سے حدِ نظر تک تو ہے دھواں ہی دھواں
شفق فروز بگولو مسافروں کی کہو

ابھر رہا ہے افق پر کوئی حسین تارا
فرازِ دار سے اتنا تو دیکھ لینے دو!

مجھے یہ ڈر ہے کہیں فاصلے نہ بڑھ جائیں
بدل رہا ہے زمانہ ذرا قریب رہو!

یہ امتحان کی گھڑیاں ہیں اہلِ دل کے لئے
تو میرے حال پہ اے جانِ جاں اُداس نہ ہو

یہی تو وقت ہے کردار کی وضاحت کا
جو کوئی جوہرِ پُرکار ہے تو پیش کرو!

عجیب بات ہے خاموش ہیں وہی ساتھی
وہ جن پہ ناز تھا اس شہرِ کم دوانوں کو

بڑے وثوق سے طے منزلیں ہوئیں لیکن
فریبِ منزلِ مقصود کھا گئے رہرو

یہ وقت سخت کڑا ہے یہ ہم بھی جانتے ہیں
مرے رفیقو مگر پھر بھی سر اٹھا کے چلو!

ہمارا عہد ہے انصاف بھی کریں گے ہم
ہمارے سامنے سب قاتلوں کو پیش کرو

قلم بجھے ہیں کہاں سے چُرا کے لائیں ہم
تمہاری زُلف کی خوشبو بتاؤ گُل بدنو

غزل

انور علیمی

سرتہہ بارِ جفا رہنے دے
جاں گرفتارِ بلا رہنے دے

ہم نہیں چارہ گری کے قائل
زخم محرومِ دوا رہنے دے

آنکھ رہنے دے نمیدہ و ملول
ہونٹ مصروفِ نوا رہنے دے

دل کو بیگانۂ آلام نہ کر
پھول کانٹوں میں گھِرا رہنے دے

یہ کبھی تجھ سے نہ پُورا ہوگا
دیکھ وعدۂ وفا رہنے دے

پھوٹ کر رولے علیمی رولے
کوئی شکوہ نہ گِلا رہنے دے



ملز مالکان نے محکمہ محنت کے افسروں کا "بھتہ" مقرر کر رکھا ہے

جب پولیس نے سنگینوں پر کارخانے چلوانے کی کوشش کی

احسان عظیم صدیقی

گذشتہ دنوں سے حکام، سرمایہ دار اور وزراء اپنے بیانات اور تقاریر کے ذریعے یہ تاثر قائم کر رہے ہیں کہ موجودہ حکومت کے قیام اور نئی لیبر پالیسی کے بعد مزدوروں کے تمام مسائل حل ہو گئے ہیں اور اب مزدوروں کو احتجاج اور ہڑتالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہڑتال کرنے والے مزدور انتشار پسند اور ملک دشمن ہیں۔ اور اسی زمرے میں کوٹری، حیدرآباد، گھارو اور کراچی کے مزدوروں کی حالیہ جدوجہد کو پیداوار کم کرنے کے ذریعے انتشار پسندی کا نام دیکر تشدد کا نام دیا جا رہا ہے۔

نئی لیبر پالیسی میں لازمی بونس، مفت تعلیم، کارخانوں کی انتظامیہ میں شرکت کے سنہرے الفاظ کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی لیبر پالیسی میں روزگار ضروریاتِ زندگی کی معیاری فراہمی کے لئے معقول اجرت مکمل ترین مفت علاج و معالجہ، بچوں کی مفت تعلیم اور مزدوروں کی پیشہ وارانہ تربیت اور مفت رہائش کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کی گئی ہے۔ ٹریڈ یونین کو مزید موثر بنانے کے لئے شاپ اسٹورڈز اور انتظامیہ میں شرکت کے نام پر مراعات یافتہ گروہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطالبات پر مزدوروں کی اجتماعی جدوجہد اور ہڑتال کو سودا کاری ایجنٹ کے تعین، مرحلہ وار گفت و شنید اور نوٹس سے پہلے خفیہ رائے شماری کے ذریعہ ہڑتال کے فیصلہ کو مشروط کیا گیا ہے۔ سابقہ قانون میں ملازمت سے علیحدگی کے لئے ایک ماہ کا نوٹس یا نوٹس کی تنخواہ دینا ضروری تھی۔ مگر اس پالیسی میں وہ بھی واپس لے لی اور اب بغیر کسی نوٹس کے ملازمت سے علیحدگی ممکن بنا دی گئی ہے۔ محکمہ محنت پہلے ہی بدعنوانیوں کا بدترین شکار رہا ہے۔ ان کے لامحدود اختیارات اور سرکاری مداخلت بڑھا کر مزید بدعنوانیوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ خصوصاً مزدور قوانین کی خلاف ورزی کو دست اندازی پولیس جرم قرار دے کر صنعتوں کو پولیس راج میں بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے سے موجود صنعتی تنازعات اور مزدوروں کے مسائل حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں مزدوروں کی بے چینی بجائے کم ہونے کے بڑھ رہی ہے۔

کوٹری اور حیدرآباد کے مزدوروں کی حالیہ جدوجہد کا سبب ان کی دیرینہ مشکلات رہی ہیں۔ ایوبی مارشل لاء کے بعد کوٹری میں صنعتی علاقہ وجود میں آیا اور گذشتہ بارہ سال کے دوران علاقہ میں چھوٹے بڑے چالیس صنعتی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن سے تقریباً دس ہزار مزدور وابستہ ہیں۔

مالکان نے مزدوروں کے حقوق پامال کرنے اور کم سے کم اجرت اور سہولیات کے بدلے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے مقصد کے تحت کوٹری شہر اور قرب و جوار میں آباد مزدوروں پر کارخانوں کے دروازے بند رکھے اور دوسرے شہروں اور علاقوں سے مزدور بھرتی کر کے لائے۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف شہر کے بیروزگاروں کو بدستور بے روزگار رکھا گیا۔ دوسری طرف باہر سے لائے گئے مزدوروں کی علاقے سے اجنبیت کا فائدہ اٹھا کر انہیں منظم ہونے نہیں دیا۔ اس طرح ان کی قوت محنت کو بھرپور طور پر لوٹا دیا جاتا ہے۔

مزدور قوانین کے تحت تین ماہ پر مستقلی۔ اوور ٹائم کے کام کا دگنی شرح سے معاوضہ، سالانہ تہواری اور اتفاقیہ رخصتوں جیسی معمولی سہولتوں سے بھی محروم رکھا گیا۔ تین ماہ پورا ہونے سے ایک دو دن پیشتر برطرفی اور زبدلی کے لفظ کو بغیر کسی جواز کے استعمال کر کے مستقلی کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ کارخانوں میں آٹھ گھنٹے کی بجائے دس اور بارہ گھنٹے یومیہ کا عام معمول رہا۔ لیکن دگنی شرح سے معاوضہ نہیں دیا گیا۔ سال پورا ہونے سے پیشتر فرضی الزامات اور رواجی نوٹس کے ذریعے ملازمت ختم کر کے سالانہ رخصت اور گریجوٹی وغیرہ کھا گئے۔ ایک دو کارخانوں کے علاوہ بیشتر کارخانوں میں تنخواہ کے ساتھ اتفاقی رخصت نہ دینا اور درخواستوں کے باوجود غیر حاضر ظاہر کرنا عام بات رہی ہے۔

قانون کے مطابق اجرت ایک ہفتہ کی مقررہ مدت میں ادا کرنے کے بجائے اکثر ایک ماہ تک ادا نہیں کی گئی۔ ریکارڈ آف سروس کے قانون کے مطابق سروس بکس بیشتر کارخانوں میں اب تک نہیں بنائی گئی ہیں۔

مزدور قوانین پر عمل درآمد محکمہ لیبر کے افسران کی ذمہ داری ہے۔ لیکن کارخانہ داروں سے مقررہ "بھتہ" حاصل کر کے معائنہ اور خلاف ورزی کے چالان کرنے سے حکام اجتناب برتتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مزدوروں کی تحریری شکایتوں پر بھی ورک مین کمیشن، فیکٹریز پے منٹ آف ویجز، ریکارڈ آف سروس، اسٹینڈنگ آرڈرس، سوشل سیکورٹی اسکیم، فیئر پرائس شاپ، صنعتی تعلقات کے تحت ورکس کونسل اور مزدور دشمن اقدامات کیخلاف محکمہ صنعت کے حکام نے کارروائی سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔

اپنے مسائل اور مشکلات حل کرنے کے لئے جب کبھی مزدوروں نے یونین بنانے کی کوشش کی مالکان نے عہدیداروں اور سرگرم کارکنوں کو برطرفی اور غنڈہ گردی کے ذریعے اور محکمہ محنت کے حکام نے نت نئے اعتراضات کے ذریعے رجسٹریشن میں رکاوٹیں ڈال کر قانون کی رسمی جدوجہد میں بھی رکاوٹ پیدا کی۔ دوسری جانب پولیس اور دیگر مقامی حکام نے مالکان کے اشارے پر فرضی الزامات کے تحت مقدمات قائم کر کے اور اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دباؤ ڈال کر مزدوروں کو ہراساں کیا اور منظم جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ مالکان اور منتظمین کی کھلی مزدور دشمنی، متعلقہ حکام کی جانبدارانہ خاموشی اور مالکان سے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں اندر ہی اندر مزدوروں میں بے چینی پھیلتی رہی اور موجودہ سال کے شروع میں مزدوروں کی بے چینی نے شدت اختیار کی اور مالکان اور متعلقہ حکام کے گٹھ جوڑ کے باوجود مزدوروں نے منظم ہونے اور اجتماعی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔

جنوری اور فروری ۱۹۷۲ء میں اورینٹ اسٹرا بورڈ، سندھ ڈیکو، کوہ نور ٹیکسٹائل۔ دادا انٹرپرائزز، سندھ ٹیکسٹائل، نشاط کیمیکل، عوامی ٹیکسٹائل، غلام حسین ہدایت اللہ ٹیکسٹائل۔ یونائیٹڈ ورکس، کریم کاٹن، اٹلس ٹیکسٹائل، لیکسن ٹوبیکو اور نور ٹیکسٹائل کے مزدوروں نے خود کو ٹریڈ یونینوں میں منظم کیا اور قانونی

وزیرِ اعلیٰ کی یقین دہانی کے باوجود مزدوروں کو رہا نہیں کیا گیا

بھول بھلیوں اور پیچیدگیوں سے گریز کرتے ہوئے براہِ راست اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے فوری مسائل کے حل کی جدوجہد کی اور اپنے اتحاد کی طاقت کے بل بوتے پر درج ذیل مطالبات پر مالکان سے تحریری سمجھوتہ کرانے میں کامیاب ہوئے۔

(۱) تین ماہ سے زائد عرصہ کے مزدوروں کی مستقلی۔
(۲) ماضی میں کرائے گئے اوور ٹائم کا کام دگنے معاوضے کے بقایاجات کی ادائیگی۔
(۳) رخصتوں کے بقایاجات۔
(۴) فیئر پرائس شاپ کا قیام
(۵) کینٹین کمیٹی کے ذریعے امدادی کینٹین۔
(۶) بس الاؤنس۔
(۷) حاضری الاؤنس۔
(۸) تنخواہوں میں اضافہ وغیرہ

مالکان نے مزدوروں کی جدوجہد ناکام بنانے اور ان کے اتحاد کو توڑنے کے لئے اپنے اپنے اداروں میں اشتعال انگیزی اور پاکٹ یونینوں کی تشکیل شروع کرائی اور مزدوروں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور انہیں ٹکرانے کے لئے مقامی مزدوروں کی برطرفیاں اور دوسرے شہروں سے مزدوروں کو بھرتی کر کے لانے کا سلسلہ شروع کیا۔ بعض مالکان نے معاہدات کی خلاف ورزیوں کے ذریعے مزدوروں میں بے چینی بڑھانی شروع کی۔ اورینٹ اسٹرا بورڈ کے مالکان حکام کی حمایت کے زور پر جنوری ۱۹۷۲ء میں کئے گئے معاہدہ پر عملدرآمد روکنے کے لئے اپنے پورے عملہ کے ساتھ روپوش ہو گئے اور چار ماہ تک تنخواہ ادا نہ کر کے مزدوروں کو معاشی چوٹ مارنا شروع کی۔ بعض اداروں مثلاً میکسن ٹوبیکو، آئی لینڈ ٹیکسٹائل اور کریم کاٹن کے مالکان نے مقامی مزدوروں کو برطرف کر کے دوسرے شہروں سے بھرتی کر کے گروہ بندی اور جھگڑا کرانے کی سازش شروع کی۔

کوٹری کے مالکان صنعت کی مقامی تنظیم نے باقاعدہ فیصلہ کر کے پورے علاقہ میں مزدوروں، ان کی ٹریڈ یونینوں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف محکمہ لیبر اور مقامی انتظامیہ اور پولیس کے عملہ کے گٹھ جوڑ کے ساتھ بڑے پیمانہ پر انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔

مالکان کی انتقامی کارروائیوں اور متعلقہ حکام کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ مزدوروں اور ان کی ٹریڈ یونینوں نے ٹیلی گراموں، قراردادوں، اخباری بیانات، جلسوں اور جلوس کے ذریعے حکام کی توجہ مبذول کرائی۔ لیکن موثر اقدام نہیں کیا گیا۔ اورینٹ اسٹرا بورڈ میں چار ماہ تک تنخواہ نہ ادا ہونے اور مقامی مزدوروں کی برطرفی اور دوسرے شہروں سے مزدوروں کی بھرتی اور حکام کی ٹال مٹول اور جانبدارانہ خاموشی علاقے کے تمام مزدوروں کی بے چینی کا ٹھوس سبب بنی۔

دو ماہ تک ہر قسم کی مفاہمتی تدابیر کی ناکامی کے نتیجے میں مزدوروں نے مجبور ہو کر عام ہڑتال کا فیصلہ کیا اور متعلقہ حکام اور مالکان کو ۲؍مئی ۱۹۷۲ء کو تحریری نوٹس دیا گیا کہ اگر ۳؍مئی ۱۹۷۲ء تک اورینٹ اسٹرا بورڈ کے مزدوروں کی چار ماہ کی بقایا تنخواہ کی ادائیگی اور دوسرے شہروں سے مزدوروں کی بھرتی بند نہ کی گئی تو تمام مزدور ۴؍مئی ۱۹۷۲ء سے غیر معینہ ہڑتال شروع کر دیں گے۔ نوٹس پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ مزدوروں نے ۴؍مئی ۱۹۷۲ء سے ہڑتال شروع کی۔ ہڑتال کے بعد بھی مسئلہ حل کرنے کے لئے کسی بات چیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مالکان کی خواہش پر مقامی انتظامیہ نے چار ضلعوں سے سینکڑوں کی تعداد میں مسلح پولیس جمع کر کے ۵؍مئی ۱۹۷۲ء کو جلسہ کے بعد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گھر واپس جانے والے مزدوروں پر بغیر کسی معقول جواز اور نوٹس کے لاٹھی چارج، آنسو گیس اور فائرنگ کی گئی۔ روڈوں، یونین آفس اور گھروں پر چھاپے مار کر یونین کے عہدے داروں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کیا گیا اور بیشتر عہدے داروں کے خلاف وارنٹ جاری کئے گئے۔ مزدور بستیوں کی ناکہ بندی کی گئی۔ اور گھروں سے جبراً گرفتار کر کے پولیس کی سنگینوں کی نوک پر کارخانے چلوانے اور کراچی اور دوسرے شہروں سے مزدور لا کر ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش کی گئی۔

۷؍مئی ۱۹۷۲ء کو دو صوبائی وزراء جناب قاسم عباس پٹیل اور جناب ستار گبول حیدرآباد آئے اور متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے سیکرٹری جنرل ایف۔ این۔ انصاری سے طویل مذاکرات کے بعد یقین دلایا کہ۔

(۱) چار ماہ کی بقایا تنخواہ فوراً ادا کی جائے گی۔
(۲) مزدوروں اور لیڈروں کی گرفتاریاں فوری طور پر بند کر دی جائیں گی۔
(۳) گرفتار لیڈروں اور کارکنوں کو رات میں چیف منسٹر سے منظوری لے کر دوسرے دن رہا کر دیا جائے گا۔
(۴) سینڈوز کے مسائل تین دن میں حل کرا دیئے جائیں گے۔
(۵) حاجی ڈوسا آئل مل کی تالہ بندی ۲۰ مئی کو ختم ہو جائے گی اور تالہ بندی کی مدت کی آدھی اجرت دی جائیگی۔

لیکن یقین دہانی پر اب تک عمل نہیں کیا گیا۔

۱۰؍مئی ۱۹۷۲ء کو وزراء کی یقین دہانی پر عمل نہ کئے جانے اور مزید گرفتاریوں کے خلاف حیدرآباد کے مزدوروں نے ۲۴ گھنٹے کی علامتی ہڑتال کی اور تقریباً پندرہ ہزار مزدوروں نے احتجاجی جلوس نکالا۔ فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ اور سیکرٹری جنرل ایف۔ این۔ انصاری صاحبان نے کسی اور اقدام سے قبل وزیر محنت ستار گبول اور چیف منسٹر صاحبان سے رابطہ قائم کیا اور گبول صاحب نے پھر یقین دلایا کہ گرفتار مزدوروں کو جلد رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن اس یقین دہانی پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔

متحدہ مزدور فیڈریشن کراچی برانچ سے منسلک یونینوں نے ۱۷؍مئی ۱۹۷۲ء کو ایک احتجاجی جلوس نکالا اور چیف منسٹر کی قیام گاہ پہنچے۔ اخباری نمائندوں شہریوں اور جلوس میں شریک مزدوروں سے کھلے میدان میں وعدہ کیا گیا کہ گرفتار مزدوروں کو ۱۸؍مئی کو رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اب تک رہائی عمل میں نہیں آئی۔ وارنٹ بدستور جاری ہیں اور اورینٹ اسٹرا بورڈ کے مزدوروں کو تنخواہ ادا نہیں کی گئی۔ وزراء کی مسلسل یقین دہانیوں پر عمل نہ ہونے کے نتیجہ میں مزدوروں کی بے چینی بدستور قائم ہے۔ مزدوروں کی بے چینی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وزراء کرام کے وعدوں کے مطابق

(۱) تمام گرفتار مزدوروں کو فوری اور غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے۔
(۲) گرفتاری کے وارنٹ منسوخ کئے جائیں۔
(۳) اورینٹ اسٹرا بورڈ کے مزدوروں کی چار ماہ کی بقایا تنخواہ ادا کی جائے۔
(۴) موجودہ عام ہڑتال کے نتیجہ میں جن مزدوروں کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ خصوصاً اورینٹ اسٹرا بورڈ، پاکستان وولن پراڈکٹس اور میکسن ٹوبیکو کے مزدوروں کو بحال کیا جائے۔
(۵) ہڑتال کے عرصہ کی تنخواہ ادا کی جائے۔
(۶) صنعتی تنازعات میں پولیس کی مداخلت کا خاتمہ کیا جائے۔
(۷) سینڈوز کے مسائل حل کرائے جائیں۔
(۸) حاجی ڈوسا آئل مل کی تالہ بندی ختم کرائی جائے اور اجرتیں ادا کرائی جائیں۔
(۹) فتح ٹیکسٹائل ملز کو فوری طور پر کھولا جائے۔ مزدوروں کی اجرتیں ادا کی جائیں اور صحیح نمائندہ یونین کے چناؤ کے لئے ریفرنڈم کرایا جائے۔

بدعنوانیاں

"یہ چارج شیٹ اُردو کالج کے سینئر وائس پرنسپل کے نام ہے۔ اسے طلبار کی ایکشن کمیٹی نے جاری کیا۔ وہ جواب دینا چاہیں تو "الفتح" کے صفحات حاضر ہیں:" (ادارہ)

یہاں پڑھنا ہے تو اسلام پسندوں کی خدمت کرو

(۱) سینئر وائس پرنسپل صاحب کا شمار "اسلام پسندوں" میں ہوتا ہے۔ کالج میں انہوں نے اسلام کی آڑ میں ہر ممکن اور ہر موقع پر رجعت پرست جماعتوں کا جھوٹا پراپیگنڈہ کیا ہے۔ خصوصاً جب رجعت پرست جماعتوں کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں تاریخی شکستوں سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے رجعت پرست مولویوں پر کالج کے دروازے کھول دیئے۔ انتخابات سے پہلے یومِ شوکتِ اسلام جیسے ڈرامے کی حمایت میں اس وقت کی طلبا یونین کے صدر جناب شمس الرحمٰن کو بیان دینے پر مجبور کرنے کی کوشش بھی کی۔ اردو کالج میں اپنے حلقہ کے اساتذہ سے اس کارنیوال کی شان میں اخباری بیان دلوایا۔

(۲) جمیل الدین عالی صاحب جو انجمن ترقی اردو کے عہدے دار بھی ہیں، کے خلاف مولانا احتشام الحق تھانوی جیسے بڑے بڑے رجعت پرست مولویوں سے اخبارات میں جھوٹے بیانات دلوائے کہ کالج میں کمیونسٹوں کو بھرا جا رہا ہے جبکہ اردو کالج میں اکثریت ان اساتذہ کی ہے جو کٹر رجعت پرست جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان جماعتوں کی حمایت میں اخباروں میں مضامین وغیرہ لکھتے رہتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ کو جسارت وغیرہ نے سُرخیاں لگا کر ہوا دی۔ اس کا مقصد حصولِ پرنسپلی تھا۔

(۳) سینئر وائس پرنسپل نے اپنے گرد اساتذہ کا ایک حلقہ بنا رکھا ہے۔ ان اساتذہ اور موصوف کے رشتے جن بنیادوں پر استوار ہیں وہ یہ ہیں:۔ کٹر رجعت پرستوں کو کالج میں نوکری دلوانا، تھرڈ ڈویژن ایم۔ ایس سی۔ نکمّا رہنا اور ہفتوں کلاسیں نہ لینا، کالج دیر میں آنا اور جلدی چلے جانا۔ ہر مقام پر موصوف کی جائز ناجائز حمایت کرنا اور ان کے ذاتی کام کرنا۔

(۴) اپنے حلقے سے باہر غیر صالحین یعنی رجعت پرستی کے مخالف اساتذہ کو یہ حضرت نہ تو کالج میں کوئی ذمہ داری سونپنا تو الگ رہا، ان کے اپنے حقوق غصب کر لیتے ہیں اور اندھے کی تقسیم کی طرح ریوڑیاں ان کے اپنے حواریوں کے حصّے ہی میں آتی ہیں۔ تقریباً چار سال پہلے جب موصوف کا طوطی بولتا تھا نباتیات کے ایک لیکچرار کے خلاف بالکل بے بنیاد الزامات لگا کر ان کا داخلہ کالج میں بند کرا دیا جبکہ وہ یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہے تھے۔ جیالوجی کے ایک لیکچرار کے ساتھ انتہائی گھٹیا سلوک کر کے غنڈہ گردی کی مدد سے اسے صدرِ شعبہ نہیں بننے دیا گیا۔ اس غنڈہ گردی سے تنگ آ کر آج کل وہ کہیں اور ملازمت کر رہے ہیں جغرافیہ کی ایک لیڈی لیکچرار کے خلاف لڑکوں کو اُکسا کر پرانی عمارت میں تبدیل کروا دیا گیا

نباتات کے صدرِ شعبہ کو ابھی تک اسسٹنٹ پروفیسر نہیں بننے دیا گیا۔ طبعیات کے ایک لیکچرار کو اپنے حلقے کے لیکچرار سے زبردستی جونیئر کر دیا گیا۔ شعبۂ حیوانیات میں سے ایک لیڈی لیکچرار کو کالج سے الگ کرا دیا گیا۔ کیونکہ وہ بے چاری بھی ان کے حلقے سے باہر تھیں۔ نباتیات کی لیڈی لیکچرار کی رخصت اور تنخواہ وغیرہ کے سلسلے میں انتہائی گندا کردار ادا کیا۔ کلرکوں وغیرہ کو کالج سے نکلوانے کے سلسلے میں انتظامیہ سے بھرپور تعاون کیا۔ ترقی پسند اساتذہ کو ہر بات پر تنگ کیا جا رہا ہے۔

(۵) طلبا کی ایک رجعت پرست تنظیم کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں ایک غنڈہ فورس موصوف کے زیرِ سایہ پرورش پا رہی ہے جس کے غنڈے ترقی پسند طلبار و طالبات میں دہشت پھیلانے کے لیے ایک دو ہفتے کے بعد کسی نہ کسی کو زدوکوب کرتے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے ان "اسلام پسند غنڈوں" نے کالج میں ہاکیوں، ڈنڈوں اور کلپوں وغیرہ کے ساتھ لیس ہو کر غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا جس میں بہت سے طلبا زخمی ہوئے۔ سالِ اوّل کے ریحان کی ناک توڑ دی گئی۔ سالِ دوم کے طالب علم ضیاء کو بھی بہت چوٹیں آئیں۔ ایک بار اداراسی قسم کے مظاہرے میں بزمِ طبعیات کے صدر جناب عثمان خالد کو بھی مارا پیٹا گیا۔ یہ غنڈے طلبار اور طالبات کو بھی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ سالِ چہارم کے سعید الدین کو کئی بار زدوکوب کیا گیا سالِ اوّل کی ایک طالبہ صبیحہ سلطان کو ان غنڈوں نے دھمکیاں دیں کہ ترقی پسند طلبا کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ تمہارا حشر بہت بُرا ہو گا۔

(۶) سینئر وائس پرنسپل صاحب اپنے پالے ہوئے غنڈوں کی طرح خود بھی طلبار و طالبات کے ساتھ وہی روّیہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اسی سال کے ایک طالبعلم عبدالجبار جب سالِ اوّل میں داخلے کی کوشش کر رہا تھا موصوف نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "میاں یہ اسلام پسند کالج ہے یہاں اگر رہنا ہے تو اسلام پسندوں کی خدمت کرتے رہنا۔"

اسی سال اپریل میں طلبار یونین کے افتتاحیہ میں جناب عبدالوحید کیٹر صاحب کی تقریر کے دوران ایک طالب علم عبدالقادر سالِ دوم نے "جئے بھٹو" کا نعرہ لگایا۔ دوسرے دن موصوف نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر دوسرے طلبا کے سامنے تھپڑ مارے اور غصّے میں ارشاد فرمایا —— "اس سے پہلے کبھی یہاں جئے بھٹو کا نعرہ نہیں لگا اور اب بھی نہیں لگے گا —— سمجھے —— !" یہ واقعہ بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد پیش آیا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا ہو گا، اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

—— سالِ چہارم کے ایک طالبعلم حسن جاوید چند دن کُرتا شلوار پہن کر کالج آتا رہا تو موصوف نے اسے بلا کر بڑی نفرت سے کہا —— "بھٹو بنتا ہے —— تم —— لیڈری ویڈری نہیں چلے گی"

الفتح

کالج کی طالبہ کو دھمکی دی گئی "تم ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتی ہو، تمہارا اخلاق خراب ہے"

بہروپیا بننا چاہتے ہو —— ؟

اسی طرح سالِ اول کے ایک طالب علم کامران کے بال پکڑ کر کھینچے اور دھکے دیتے ہوئے کہا —— "تم اسلام پسندوں کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے ہو"

سالِ دوم کی طالبہ آنسہ صبیحہ انیس اور سالِ سوم کی طالبہ آنسہ صابرہ کو مختلف موقعوں پر بُرا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں۔ ایک طالبہ کو دفتر بلا کر کہا —— "سُنا ہے کہ تم اسلام پسندوں کے خلاف بہت باتیں کرتی ہو۔ تمہارا اخلاق خراب ہے میں تمہیں جانتا ہوں ——" ایک خط نکالا اور کہا کہ یہ خط تمہارے نام پر آیا ہے۔ اس کے بعد خط پھاڑ کر طلباء اور اساتذہ کے سامنے پڑھا جبکہ کوئی شریف انسان اس خط کی ایک سطر تک کسی دوسرے کے سامنے پڑھ کر گردن جھکا لے اور اس طالبہ سے پوچھا کہ تمہارے گھر پر بھی کوئی ایسا خط آیا ہے اس نے جواب دیا کہ ہاں آیا ہے۔ اس طرح بے بنیاد اور گھٹیا اور ذلیل باتیں سُن کر وہ طالبہ مسلسل گھنٹوں روتی رہی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرت کو الہام ہوا تھا کہ خط میں گندی باتیں لکھی ہوئی ہیں اور گھر پر بھی کوئی خط پوسٹ کیا گیا ہے؟

تقریباً دو ماہ کے مختصر سے عرصے میں ہونے والے یہ چند واقعات طلباء و طالبات کے ساتھ موصوف کے اسلام پسند سلوک کی چند جھلکیاں تھیں۔ اس طرح کے بے شمار واقعات عرصے سے ہوتے چلے آرہے ہیں کیا ایسا شخص کسی تعلیمی ادارے کی سربراہی کر سکتا ہے؟

(۷) علاقائیت پرستی تو ان حضرت کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ہندوستان میں جس صوبے سے تعلق رکھتے تھے اقامتی اردو کالج میں اساتذہ کی ایک بھاری اکثریت اسی صوبے سے تعلق رکھتی ہے۔

(۸) ابھی تک کالج کی تقریبات میں جتنے لوگ مہمانِ خصوصی یا صدر کی حیثیت سے بلوائے گئے سب نے آکر سوشلزم کے خلاف بے بنیاد اور مکروہ پراپیگنڈہ کیا۔ کئی ایک نے مختلف موقعوں پر صدر ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف تقاریر کیں۔ سوشلسٹ دوست ممالک خصوصاً چین کے خلاف انتہائی غلیظ اور گمراہ کن سیاسی پراپیگنڈہ کیا۔ کالج کا اسٹیج صرف ایک رجعت پرست اسلام پسند پارٹی کا اسٹیج بن کر رہ گیا۔ سوشلزم اور ترقی پسند جماعتوں کے خلاف اور رجعت پسند جماعتوں کے حق میں آزادانہ طور پر ہینڈ بل اور پمفلٹ تقسیم کیے جاتے ہیں جب کہ یہ حق دوسروں کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔

(۹) کالج سے موصوف کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ رات دن اپنے حلقے کے اندر بیٹھے سب کچھ کرتے ہیں لیکن اگر کوئی بات نہیں ہوتی تو وہ کالج سے متعلق ہے سائنس کا سیکشن نئی عمارت میں منتقل ہوئے تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ ابھی تک بجلی نہیں آئی، گیس کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ ۲½ سال تک ٹیلیفون نہیں لگ سکا۔ کالج کے ایک بڑے حصّے میں پلاسٹر نہیں ہو سکا۔ جہاں پلاسٹر ہو گیا ہے وہاں سفیدی تک نہیں ہوئی۔ طلباء کی ساری سرگرمیاں نعت خوانیوں تک محدود کر کے رکھ دی گئی ہیں کُل تین سو طلباء زیرِ تعلیم ہیں۔

(۱۰) ۱۹۶۴ء میں جب یہ انجمن اتحادِ طلباء کے نگران تھے تو انہوں نے طلباء کے انتخابات میں اتنی دھاندلی کی کہ ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا اور اس میں عدالت کا فیصلہ سازشی وائس پرنسپل اکرام الرحمٰن کے خلاف ہوا۔

(۱۱) ۱۹۶۴ء میں اکرام الرحمٰن نے جامعہ کراچی کے امتحانات میں اردو کالج کے سینٹر میں دھاندلی کی۔ طلبا کو خوب نقل کرائی۔ جامعہ نے سخت اقدام اٹھاتے ہوئے کالج کو تین سال تک سینٹر نہیں بنایا اور سرزنش کے طور پر انتظامیہ نے اکرام الرحمٰن کو وائس پرنسپل کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا۔

(۱۲) ۱۹۶۸ء میں اکرام الرحمٰن کو جمیل الدین عالی صاحب نے دوبارہ وائس پرنسپل مقرر کیا لیکن دوبارہ بھی وہ تخریبی کارروائیوں سے باز نہ آئے۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں اردو کالج کے طلباء نے انجمن اتحادِ طلباء اردو کالج کے سالانہ جلسہ میں اکرام الرحمٰن کو کرسی نہیں دی اور جلسہ سے "باعزت طریقے" سے باہر نکال دیا لیکن اس رسوائی کے باوجود انہوں نے استعفیٰ نہیں دیا

(۱۳) اکرام الرحمٰن کے خلاف کالج کے ایک ہزار طلباء نے دستخطی مہم بھی چلائی۔ چنانچہ اس کے بعد جمیل الدین عالی صاحب نے اکرام الرحمٰن کا تبادلہ اقامتی اردو کالج میں کر دیا اس پر اکرام الرحمٰن نے عالی صاحب کے خلاف اخباری مہم چلائی۔

(۱۴) جغرافیہ کا مضمون زبردستی دیتے ہیں۔

(۱۵) لائبریری میں عوام دوست پرچے مثلاً "الفتح، مساوات، شہاب اور نصرت وغیرہ پر پابندی عائد کر دی ہے۔

پیپلز پارٹی کی تنظیم۔ عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں

عوام جس انقلاب کے منتظر تھے وہ برپا نہ ہُوا



شکیل ضیاؔ۔ نائب صدر پیپلز پارٹی اورنگی ٹاؤن کراچی

(۱) پارٹی کے برسراقتدار آنے پر ہمارا پہلا تاثریہ تھا کہ اب دکھ کے دن اور ستم کی رات کٹ جائے گی۔ جس پارٹی کی ہمہ گیر تحریک سیاست کے تالاب کو کھنگال دے اور پوشیدہ گندگی کو سطح پر لے آئے ——— ہر دل میں انقلاب کی آگ بھڑکا دے ——— ایسی پارٹی عوامی امنگوں کا مظہر بن کر دلوں پر راج کرتی ہے لیکن پارٹی میں ایسے کردار موجود ہیں ——— جو عوامی خواہشات کو پامال کر کے سوشلزم کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روک رہے ہیں ——— مزدور کسان راج قائم کرنے سے ہچکچا رہے ہیں ——— عوام جس انقلاب کے لئے بے چین تھے اور جس کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اُس کے خلاف ایک زبردست سازش ہوئی ——— مگر وہ عزائم کی تکمیل کے لئے عوام میں پھوٹ ڈال کر "انصاف اور مساوات" کی علمبرداری کو روک لینا چاہتے ہیں لیکن ہم قائدِ عوام کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر تمام سازشوں کو ختم کر دیں گے۔

(۲) پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد پارٹی کے رہنما عوام سے دور ہو گئے ہیں۔ عوامی رابطہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے مفاد پرست اور سازشی گروہ عوام کو گمراہ کر کے مایوسی اور انتشار پھیلا رہے ہیں۔ پہلے پارٹی کے جلسے ہوتے تھے۔ پارٹی کے موقف سے آگاہی ہو جاتی تھی۔ اس طرح پارٹی اور عوام دشمنوں کے پھیلائے ہوئے زہریلے پروپیگنڈہ کا توڑ بھی ہو جاتا تھا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اندرونی امن ہو۔ کارکنوں کے حوصلوں کو بلند کیا جائے۔ انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ان کی قربانیوں کا صلہ ملے گا۔ پارٹی کارکنوں کو تعلیم دے کر منظم کیا جائے تاکہ وہ عوام دشمن قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر وہ سیاسی شعور سے مسلح ہوں گے تو انہیں کوئی زیر نہ کر سکے گا۔ اس طرح وہ عوام کے اجتماعی بھلائی و سلامتی کے مطابق کام کر کے انہیں بھٹکنے سے بچا لیں گے۔

(۳) یہ ستم ظریفی ہے کہ جس پارٹی کا قائد عوام سے رابطہ کے لئے شہر شہر، گاؤں گاؤں اور عوام سے انہی کی زبان میں بات چیت کرے۔ اس پارٹی کے دیگر راہ نما آج عوام سے دور رہیں۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ ہم جلسہ کر کے اپنے لیڈر کو بلا سکیں۔

ہمارے علاقے کے ایم۔ پی۔ اے صاحب الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد آج تک اپنے حلقۂ انتخاب میں نہیں آئے۔ عوام کی تکلیف نہ کبھی دیکھی اور نہ سُنی۔ ایم۔ این۔ اے صاحب وزیر تعلیم بن کر دُور چلے گئے۔

(۴) جناب جو سرکاری عہدوں پر نہیں ہیں ——— وہ کون سا شفقت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ جو ہم ان لوگوں سے توقع رکھیں جو اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے آج تک جتنے بھی لیڈروں سے بات یا ملاقات کی تو صرف عقیدت اور محبت کی بنیاد پر۔ کبھی بے جا تعریف یا خوشامد نہ کی، اس لئے بے تکلف قرب حاصل نہ کر سکے۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں جب بھٹو صاحب "کھر ہاؤس" ملتان تشریف لائے تو محبوب رہنما کے استقبال کے لئے ڈیوٹی پر جانے کی بجائے بلا ارادہ قدم کشاں کشاں ایئر پورٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اور اپنے قائد کا استقبال کرتے ہوئے "کھر ہاؤس" تک آئے تو دروازہ بند کرتے ہوئے ہم نے کھر صاحب سے اندر آنے کی خواہش کی وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے کہنے لگے "یہ جگہ نہیں ہے" ہم نے ایک طرف کھڑے رہنے کا اصرار کیا ——— تو دروازہ کھل گیا تھا ——— ملتان کے شہری پانی کے ریلے کی طرح بڑھے تو بند لگ چکا تھا۔ اندر ہال بھرا ہوا تھا۔ یہ واقعہ یاد آتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ کھر صاحب آج بھی اچھے رویے اور کلام کے مالک ہوں گے۔

(۵) بے روزگار اور مصیبت زدہ کارکن اور وہ لوگ جو دکھ سہہ سہہ کر زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جن میں مرنے یا مارنے کی خواہش جنم لینے لگتی ہے۔ وہ بغاوت کے نئے غلط راہوں پر لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے اچھے مستقبل کا یقین نہیں۔ وہ اپنے حال اور مستقبل سے پریشان ہیں۔ ایسے تمام کارکنوں و دیگر افراد کو روزگار مہیا کر کے اُن کے دکھ اور مایوسی کو دور کر کے مستقبل کے تحفظ کا یقین دلایا جائے۔ انہیں سیاسی تعلیم اور محنت کا درس دے کر اُن کے شعور کو بلند کیا جائے۔ کارکنوں میں آپس کے اتحاد کے لئے ایک دوسرے کا احترام ہو۔ ان کو آپس میں ملانے کے لئے مل بیٹھ کر کوئی پروگرام بنانا چاہیئے۔ کر دہ مہینہ میں ایک بار مشترکہ طور پر اجلاس کریں تاکہ وہ متفقہ طور پر تعمیر کا کام عملی طور پر کر سکیں۔ پارٹی کے عہدیدار پارٹی کے کارکنوں سے چنے جائیں۔ ہر کارکن کی اہمیت اس کی جدوجہد قربانی اور کارکردگی کی بنیاد پر تسلیم کیا جائے۔ یہ نہیں کہ جو خوشامد پرست ہو اس کو قریب کر لیں اور جو اپنے قائد کی آواز پر لبیک کرتے ہوئے ۱۹۶۸ء سے تمام دکھ درد کی پرواہ کئے بغیر ظالم سرمایہ دار اور بے رحم مذہبی سوداگر سے ٹکرا گئے تھے ان کو نظر انداز کر دیں۔ غریب اور باصلاحیت کارکنوں کو آگے آنے کا موقع ملنا

چاہیئے: تاکہ غربت کے خلاف جنگ میں وہ ظالم جاگیردار، اور سازشی سرمایہ دار عناصر کو ختم کر کے مزدور کسان کا راج قائم کر سکے۔ ورنہ بڑے بڑے سرمایہ دار، جاگیردار نواب اور وڈیرے۔ خان، مزدور کسان راج قائم کرنے میں رکاوٹ بنتے رہیں۔

(۶) پارٹی کے بااثر افراد میں ایسے لوگ بے شک موجود ہیں۔ جو ناجائز ذرائع سے کما رہے ہیں۔ اس طرح پارٹی کو بدنام کر رہے ہیں۔ ہمارے علاقہ میں بھی سو پلاٹ کا مالک موقع پرست نام نہاد لیڈر ایک ایم پی اے سے مراسم بڑھا کر اپنے ناجائز قبضہ کو جائز قرار دلوا چکا ہے۔ حالانکہ انہی ایم پی اے کی موجودگی میں ایک جلسۂ عام کے عوام نے مذکورہ شخص کے خلاف مظاہرہ ہوا تھا۔

(۷) پارٹی کا کوئی رکن بھی جو باشعور ہوگا وہ ایسی مداخلت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی حد سے آگے نکل کر کبھی یہ بات نہیں کر سکتا۔ جو پارٹی ڈسپلن کو جانتا ہوگا کبھی ایسی مداخلت نہیں کرے گا۔ جو اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ عوامی خادم کی حیثیت سے انسانوں کے کام تو آئے گا۔ وہ ان کی دلجوئی اور مدد کے لئے اپنے آپ کو ہر مقام پر لا سکتا ہے۔ لیکن قانون شکنی نہیں کر سکتا۔ کچلے ہوئے انسانوں میں کارکن بھی شامل ہیں۔ یہ حساس اور حق گو کارکن ان کی زبان ہیں۔ یہ خود بھی شدت دکھ سے کراہ رہے ہیں وہ اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تو وہ پولیس، نوکر شاہی' یا عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کیسے کر سکتا ہے۔ ویسے بھی کارکنوں کو کون اہمیت دیتا ہے ــــ؟ وہ اپنی حیثیت کو جانتے ہیں۔ یہ تاثر جو عام ہے صرف پارٹی کو بدنام کرنے کے لئے پھیلایا گیا ہے۔

ہاں اگر کوئی جائز امداد کسی کو درکار ہو تو ہم بخوف اس کی مدد کرتے ہیں، کہ یہ ہمارا انسانی فرض ہے۔!

پیپلز پارٹی کے رہنما میلے کپڑوں سے نفرت کرنے لگے



ماسٹر فرید شاہ، رکن ورکنگ کمیٹی ضلع کوہاٹ

(۱) میں پاکستان پیپلز پارٹی میں عوام دوست منشور کی بنیاد پر شامل ہوا تھا۔ میں نے پارٹی کی ترقی کیلئے دن رات محنت کی۔ لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد پارٹی میری ان توقعات پر پوری نہیں اتری "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے اصول کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ داری ختم کرنے کی بجائے چند کارخانوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے۔ لیکن اس سے مزدوروں کا استحصال برقرار رہے گا۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ براہ راست کی بجائے بالواسطہ استحصال کیا جائے گا۔ منافع اب بھی سرمایہ داروں کی جیب میں جائے گا۔ زرعی پالیسی بھی مایوس کن ہے۔ اس سے مزارعین کو فائدہ ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ بنیادی بات جاگیرداری کا مکمل خاتمہ اور جاگیرداروں کا معاشرتی اثر و رسوخ ختم کرنا ہے جس کے متعلق کوئی بھی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ خود میرے کسان ساتھی اس پالیسی سے مایوس ہو گئے ہیں۔ ذرائع پیداوار پر اب بھی مٹھی بھر افراد کا قبضہ ہے۔ جس سے خوشحالی کے دور کی باتیں محض دھوکہ نظر آتی ہیں۔ خود مسٹر بھٹو نے کوہاٹ کے عوام سے جلسہ عام میں وعدہ کیا تھا کہ "میری حکومت میں کوہاٹ جنت نظیر تمہاری ہوگی"۔ لیکن ابھی تک کچھ نہیں کیا گیا۔"

(۲) برسر اقتدار آنے سے قبل کارکنوں سے رہنماؤں کا جو برائے نام رابطہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ جس سے کارکن پارٹی سے مایوس ہو چکے ہیں۔

معراج محمد خان، طارق عزیز اور ڈاکٹر شمیم زین الدین سے ہماری کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ معراج محمد خان کے متعلق تو مشہور تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے لیکن معراج اپنے نظریات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس سے بھی مایوسی ہوئی اور پارٹی کا یہ فعال ترین حصہ بھی اسلام آباد کی رونق میں کھو گیا۔ انقلاب کے درس دینے والا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے درمیان گھر گیا۔

(۳) کارکنوں میں اتحاد اور تنظیم کا سوال ہے۔ ایک محنت کش ہونے کی حیثیت سے ہم استحصال کے خلاف پارٹی میں شامل ہوئے تھے اور جب تک استحصال جاری رہے گا۔ ہماری جدوجہد بھی جاری رہے گی۔ کیونکہ ہمارا تو بنیادی مسئلہ ہی روٹی کپڑا اور مکان ہے۔ دوسری جماعتوں کے افراد پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کو اُوپر سے مسلط کیا جا رہا ہے۔ جس سے کارکنوں میں مایوسی پیدا ہو رہی ہے۔ پارٹی کی تنظیم کو صرف جمہوری بنیاد پر ہی مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہماری پارٹی کا انجام بھی دوسری پارٹیوں سے مختلف نہ ہوگا۔

(۴) پارٹی کے بااثر افراد نے ذاتی مفاد کے لئے پارٹی کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے ناجائز کام بھی فوراً ہو جاتے ہیں جب کہ مزدوروں، کسانوں کے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔ میرا ایک دوست جو پارٹی کا سرگرم کارکن ہے لاری اڈہ پر بسوں سے سامان وغیرہ اٹھاتا ہے حکومت ملنے پر اس نے خون پسینے کی کمائی سے ۲۰ روپے کی مٹھائی تقسیم کی۔ اس کا کہنا ہے کہ میرے میلے کپڑوں کی وجہ سے لیڈروں نے مجھے ملنا ہی بند کر دیا ہے۔ میں نے بھٹو صاحب اور سابق گورنر سرحد مسٹر حیات خان کو مبارک باد کے خط لکھے لیکن افسوس کہ ان کے جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی گئی۔

(۵) کارکنوں کو ضرور انتظامیہ پر نظر رکھنی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی بھی غریب کارکن نے انتظامیہ سے ناجائز کام نہیں لیا ہوگا لیکن دوسری جماعتوں کے بے بنیاد پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خواہ مخواہ کارکنوں پر عدم اعتماد کیا جا رہا ہے اور اس طرح سے اپنی پارٹی کے کارکنوں کو دوسری پارٹی کی نظروں میں گرایا جا رہا ہے۔ آخر میں اتنا عرض ہے کہ اگر ہماری

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

مزدور کسان پارٹی کی دو روزہ کانفرنس کی رپورٹ

مزدور کسان تحریک کے خلاف ولی خان کا واویلا

زبیر حسین

طبقاتی جدوجہد کی لپٹیں جب ولی خان کے خرمن کو جھلسانے لگیں تو خان خاقان نے بڑے ہی مایوس کن انداز میں اپنی گھبراہٹ کا اظہار اس شکایت یا شکوہ سے کیا کہ میجر اسحٰق صاحب پنجاب سے آکر صوبہ سرحد میں کسان جدوجہد کی رہنمائی کر رہے ہیں لیکن پنجاب میں طبقاتی جدوجہد کا آغاز کیوں نہیں کرتے؟ پھر کیا تھا ولی خان کے مجاورین نے دردر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ لیکن ۲۹ر ۳۰ر اپریل ۱۹۷۲ء سے خاقان کے خاناں مجاوروں کا یہ واویلا خصوصاً پنجاب میں تو بہت ہی لمز در پڑ گیا اور مجاورین کے یہ چھوٹے چھوٹے گروہ دبک کر کونے کھدرے ڈھونڈنے لگے۔

۲۹ر ۳۰ر اپریل ۱۹۷۲ء پنجاب کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم موقع تھا۔ پنجاب مزدور کسان مندوب کانفرنس اپنی ضرورت اور اہمیت کے نقطۂ نظر سے کافی دوررس نتائج کو اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی۔

۲۸ر اپریل ۱۹۷۲ء کو کوئی دس بجے دن پنجاب مزدور کسان پارٹی کے عہدیداران اور اراکین مجلسِ عاملہ اس انتہائی دوستانہ اور بے تکلف ماحول سے اُٹھ کر مزدور کسان پارٹی لاہور کے نئے دفتر واقع کوچہ جھلن شاہ پرانی انارکلی کی جانب چلے جہاں پنجاب مزدور کسان پارٹی کی مجلسِ عاملہ کا خاص اجلاس ہو رہا تھا۔ اس خصوصی اجلاس میں پارٹی کے رہنماؤں نے اپنے اپنے علاقوں کے بارے میں مفصل رپورٹیں پیش کیں۔ گجرات، گجرانوالہ، ملتان، لاہور، میانوالی، بہاولپور بہاول نگر، رحیم یار خان، لائلپور اور کئی دوسرے علاقوں کے بارے میں طبقاتی بنیاد پر مشتمل رپورٹوں پر مجلسِ عاملہ نے غور و خوض کیا اور عملی جدوجہد کی راہیں متعین کیں۔ اس کے بعد صدرِ اجلاس میجر اسحٰق محمد نے پوری کارروائی کا خلاصہ پیش کیا اور صدارتی تقریر کے بعد اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

پہلا اجلاس

۲۹ر اپریل ۱۹۷۲ء کو گیارہ بجے دن جب میں وائی ایم سی۔ اے ہال میں داخل ہوا تو پورا ہال حاضرینِ اجلاس سے بھر چکا تھا۔ چاروں جانب سُرخ ہی سُرخ جھنڈے اور بینر نظر آ رہے تھے۔ اسٹیج کی پشت کی دیوار پر تین بہت ہی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔

اسٹیج پر مزدور کسان پارٹی کے پچاس رہنما تشریف فرما تھے جنہیں صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی جناب میجر اسحٰق محمد، مشہور مزدور کسان رہنما جناب افضل بنگش، انقلابی دانشور جناب پروفیسر ایرک سپرین، جناب سہراب اسلم ڈاکٹر فیروز احمد اور سرحد مزدور کسان پارٹی کے صدر جناب شیر علی باچا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سابق طالب علم رہنما اور لاہور مزدور کسان پارٹی کے ایک لیڈر جناب سیدین انجام دے رہے تھے۔ میٹنگ کا آغاز سُرخ فراک میں ملبوس ایک چھوٹی نازک سی بچی عظمہ فاروق نے کیا جس کی عمر بمشکل پانچ سال رہی ہو گی۔

اس کے بعد سیدین نے "عوامی محاسبہ کمیٹی" کا پیغام سنایا۔ پیغام کے بعد جناب محمد یعقوب نے اپنا مقالہ "کوہ نور ریان ملز مزدوروں کے قبضے میں" پڑھا۔ محمد یعقوب صاحب نے بتایا کہ ہم نے کوہ نور ریان ملز میں ترقی پسند کارکنوں کا ایک متحدہ محاذ بنایا اور مل کے مخصوص صورتِ حال کا ٹھوس تجزیہ کرنے کے بعد اور وہاں موجود تضادات کا جائزہ لینے کے بعد ۲۳ر فروری ۱۹۷۲ء کو مل پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مزدوروں کے قبضہ کے بعد انتظامیہ کے ۲۹ بدعنوان افسروں بشمول حکومت کے نامزد کردہ افسر کو مل کی حدود سے باہر نکال دیا ہے۔ گو کہ کوہ نور ریان مل انتہائی پیچیدہ کارخانہ ہے لیکن مزدوروں نے اس انتہائی پیچیدہ کارخانے کو انتہائی عمدگی سے چلا کر سامراجیوں اور سرمایہ داروں کی اس سازش کو ناکام بنا دیا ہے کہ کارخانوں کے انتظام کے لیے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔

مزدوروں کے قبضہ کے دوران مل کی پیداواری استعداد آٹھ ٹن سے بڑھ کر ۱۰٫۷ ٹن تک ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ پیداوار کی کوالٹی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ مزدوروں کی اس کامیابی سے سرمایہ داروں کی نیندیں اڑ گئیں اور انہوں نے انتہائی مکروہ سازش کے ذریعے گیس کی سپلائی لائن اُڑا دی عام صورتِ حال میں اس کو ٹھیک کر کے دوبارہ سپلائی بحال کرنے میں تقریباً دس دن کا عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن مزدوروں نے چند گھنٹوں میں اس کو ٹھیک کر کے اپنی بہترین صلاحیت کا لوہا منوا لیا ہے۔

فوزیہ نازلین نے "عورتوں کی حمایت کے بغیر انقلاب ناممکن ہے" کے زیرِ عنوان اپنا مقالہ پیش کیا جس میں عوامی جمہوری انقلاب کی جدوجہد میں عورتوں کے کردار اور اس کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا پردہ چاک کیا۔

فوزیہ نازلین کے بعد چنیوٹ سے دیہاتی لیبر تنظیم کے صدر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مزدور کسان پارٹی سیاسی، سماجی اور ثقافتی طور پر مزدوروں اور کسانوں کی خدمت کر رہی ہے اس لیے ہم مزدور کسان پارٹی کے ساتھ اپنے برادرانہ اتحاد کا اعلان کرتے ہیں۔

اس کے بعد میجر اسحٰق محمد نے کینیڈا سے شائع ہونے والے رسالہ "پاکستان فورم" کے مدیر ڈاکٹر فیروز احمد کا تعارف کرایا جو کینیڈا سے مزدور کسان مندوب کانفرنس میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ اس مختصر تعارف کے بعد ڈاکٹر فیروز نے کہا کہ میں کینیڈا، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، یورپ

کے دوسرے ملکوں اور مشرق وسطیٰ میں سکونت رکھنے والے ترقی پسند کارکنوں کی جانب سے مبارکباد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہم سب اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ انقلاب صرف مزدوروں، کسانوں کی ہی قیادت میں جنم لے سکتا ہے اور دانشوروں کو چاہیئے کہ وہ مزدور کسان قیادت کو تسلیم کر لیں۔ ڈاکٹر فیروز نے کہا کہ ہم یہاں مزدوروں اور کسانوں کو کچھ سکھانے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ ہم عمل کے میدان میں مزدوروں کسانوں سے سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی جناب اسحٰق محمد اپنی جگہ سے پھر اٹھے اور تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ پاکستان کے عظیم انقلابی دانشور جناب پروفیسر ایرک سپرین آپ سے خطاب فرمائیں گے۔ میجر اسحٰق صاحب کے اس اعلان پر لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ پندرہ منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ جب پروفیسر صاحب نہایت متانت کے ساتھ اٹھے تو ان کے سینے پر مزدور کسان پارٹی کا سُرخ بیج واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے "انقلاب اور دانشور" کے عنوان پر مارکسی، لیننی نکتہ نظر کو سمجھایا آپ نے کہا کہ دانشوروں کو اپنی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے اور اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنی چاہیئے جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے یہ دانشوروں کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ دانشور انقلاب کو جنم نہیں دے سکتا۔ انقلاب کے خالق محض مزدور اور کسان طبقات ہیں۔ دانشور کا کام محض ایک دایہ (MID WIFE) کا ہے جو زندگی کو جنم نہیں دیتی لیکن جب زندگی جنم لیتی ہے تو وہ اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ اسی طرح دانشور بھی جنم لینے والے انقلاب کی دیکھ بھال کا فریضہ ہی انجام دے سکتا ہے

دوسرا اجلاس

دوسرا اجلاس پانچ بجے شام تلاوتِ کلام پاک سے شروع ہوا۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد تقی نایابؔ اور عبدالرشید اشک نے اپنی اپنی نظم پیش کی۔

صدرِ مجلس جناب میجر اسحٰق محمد صاحب نے اعلان کیا کہ تمام مندوبین و مبصرین کھڑے ہو کر دنیا بھر کے محنت کشوں کے بین الاقوامی گیت (انٹرنیشنل) پنجابی زبان میں گائیں گے۔ پچاس ساٹھ افراد اسٹیج پر میجر اسحٰق کے ساتھ کھڑے تھے۔ جناب افضل بنگش، پروفیسر ایرک سپرین اور شیر علی باچا بھی تھے۔ باقی تمام لوگ اپنی اپنی جگہ مؤدب کھڑے ہو گئے اور پھر ایک انقلابی ماحول میں تمام ساتھیوں نے مل کر "انٹرنیشنل" گایا:۔

میجر محمد اسحٰق نے پنجابی زبان میں ایک انقلابی نظم پیش کی۔ اس کے بعد لائل پور کے بزرگ رہنما بابا بھلے چک نے مندوبین سے خطاب کیا اور حاضرین سے عرض کی کہ وہ اپنے اپنے گاؤں اور دیہاتوں میں پھیل کر ہر ایک کو ہشت نگر بنا دیں۔

سندھ ہاری رپورٹ کے سلسلے میں مشہور سابق آئی سی ایس اور ممبر بورڈ آف ریونیو جناب مسعودؔ کھدر پوش نے تقریر کرتے ہوئے ہشت نگر کسان تحریک کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ عملی جدوجہد سے وابستہ ہونے کے بعد ہی اس قابل ہو سکیں گے کہ مزدور کسان مندوبین کے اس اجلاس سے خطاب کر سکیں۔ بہرحال انہوں نے کہا کہ کسان اور مزدور عوام جاگیرداروں، نوابوں، سرداروں اور بڑے زمینداروں کے بوجھ تلے پس رہے ہیں لیکن ہشت نگر نے ثابت کر دیا ہے کہ اب مزدور کسان انقلاب بہت جلد جنم لے گا۔

مشہور شاعر انور علیمؔ نے اپنی دو مشہور نظمیں ؎

"شیش محل کے مکینوں کو خبر دیتا ہوں
جاگ اٹھے ہیں میرے دیس کے مجبور عوام"

اور

؎ "اب ہماری تمہاری کھلی جنگ ہے" سنائیں

اس کے بعد نیشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سابق صدر اور مزدور کسان پارٹی بہاول نگر کے رہنما جناب امتیاز عالم نے مارشل لاء اور پارلیمانی جمہوریت کے مسئلہ پر بات کی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ مارشل لاء جمہوری ہو، عوامی ہو یا پارلیمانی، ہمیشہ مزدوروں کسانوں اور دوسرے محنت کش عوام کا دشمن ہے۔

سید عمر صاحب نے کہا کہ ہشت نگر کے کسانوں نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ پنجاب کے دوستوں کے مشکور ہیں جنہوں نے ہماری چھوٹی سی قربانی کی قدر کی۔ لیکن ہم اس اعزاز کے، جو کہ ہمیں دیا گیا ہے، اس وقت قابل ہوں گے جب ملک بھر کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو نیست و نابود نہیں کر دیتے۔ صوبہ سرحد کے کسان اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمارا دشمن کوئی پنجابی نہیں ہے۔ تمام ظالم ہمارے دشمن ہیں چاہے وہ پٹھان ہوں یا پنجابی سندھی ہوں یا بلوچ!

آخر میں مزدور کسان پارٹی کے رہنما اور سرحد کسان تحریک کے قائد جناب افضل بنگش نے مندوبین سے خطاب کیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں کسان تحریک پر عائد مختلف الزامات پر کھلی بحث کی اور ان کا مؤثر جواب دیا۔ جناب افضل بنگش نے کہا کہ سرحد کسان تحریک پر ایک الزام یہ ہے کہ جناب یہ تو کسان تحریک نہیں ہے بلکہ قبائلی لڑائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوبے میں ۹۵ فیصد لوگ محمد زئی ہیں۔ باقی پانچ فیصد میں مہمند وغیرہ ہیں۔ چارسدہ کے کچھ حصے میں پچیس یا تیس فیصد کسان مہمند ہیں، مالاکنڈ میں اتمان زئی کی آبادی ہے، دیر میں سب اتمان خیل ہیں۔ سوات میں کسانوں کا بڑا حصہ گوجروں پر مشتمل ہے۔ ہاتھیان کے علاقے میں اتمان خیل بستے ہیں لیکن ان سب علاقوں میں کسان تحریک بہت مضبوط ہے اور مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ مزدور کسان پارٹی کے تحت متحد ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خانانِ خانان کا پراپیگنڈہ عوام دشمن سازش کا حصہ ہے۔

جناب افضل بنگش نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ نیپ نے سرحد میں ہمارے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا اور چھوٹے مالکان کو کھیت مزدوروں اور غریب کسانوں سے لڑانے کی مکارانہ سازش تیار کی تھی۔ کئی ایک جگہ پر چھوٹے مالکان نے کسانوں کے خلاف محاذ بنا لیا تھا۔ یہ مسئلہ ہمارے لیے ایک انتہائی نازک سوال تھا اور ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا لیکن ہم نے انتہائی خوش اسلوبی سے اس مسئلہ کو حل کیا اور چھوٹے مالکان، کسانوں اور کھیت مزدوروں میں برادرانہ اتحاد پیدا کیا۔ گو کہ ہمیں اس کے لیے سخت ترین جدوجہد کرنی پڑی مگر ہم نے ولی خان کی مکارانہ چال کو ناکام بنا دیا ہے۔ مقامی عوامی کمیٹیوں کی بنیاد پر ہم نے انقلابی متحدہ محاذ کے لیے پروگرام تیار کیا ہے جس پر چھوٹے مالکان، مزارع اور کھیت مزدور عمل کر رہے ہیں۔ جناب افضل بنگش نے صوبے میں کسانوں پر ہونے والے مظالم کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ہاتھیان میں ۷ہم کسانوں کو مختلف دفعات کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بندوقیں بھی ضبط کر لی گئی ہیں۔ تھانے کے علاقہ میں جاگیرداروں نے غلام قادر کے خلاف سازش کی اور اس کو سزا دینے کے لیے مفروروں اور غنڈوں کو بلایا جنہوں نے کسانوں پر خوب ظلم و ستم کیا۔ اس طرح کے واقعات روزانہ ہو رہے ہیں لیکن نیپ اور جمعیت العلماء کی حکومت کسانوں کے خلاف جاگیرداروں کی حمایت میں کافی سے زیادہ سرگرمی دکھا رہی ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود مزدور کسان تحریک ملک بھر میں پھیل رہی ہے۔ خود ولی خان کے تمام مزارع، گھریلو ملازمین مزدور کسان پارٹی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں









خیبر سے کیماڑی



پیپلز پارٹی ڈیرہ غازیخاں کے نائب صدر حمید اصغر شاہین جنہیں پولیس نے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا

[illegible]

ڈیرہ غازیخاں

غریب مزارع سے کہا گیا سر اُٹھاؤ گے تو کچل دیا جائے گا

دبیس عدیم

رسائل وجرائد میں یہ خبر بڑی بڑی سرخیاں لگا کر شائع کی گئی کہ مرکز کی ہدایات پر ضلع ڈیرہ غازی خان کی پولیس غنڈہ عناصر کو سختی سے کچل دے گی۔ اس خبر کو اس مرتبہ اتنی اہمیت دینا، اہل نظر سوچنے پر مجبور تھے کہ اس قسم کی خبروں کا زبردست پروپیگنڈہ کیوں کیا جارہا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد پولیس نے اپنی کارگذاری کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ تحصیل راجن پور علاقہ روجہان میں پولیس کی گولی لگنے سے ایک غریب مزارع ہلاک اور دوسرا شدید زخمی ہوا۔ پولیس اور جاگیرداروں کی ملی بھگت سے غریبوں پر جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں وہ ہشت نگر کے واقعات سے کم نہیں۔ عوامی نمائندوں کی حکومت کے قیام پر غریب مزارعین نے بھنگڑہ ڈالا اور مسرت کا اظہار کیا اور ایک حسین تصور غیر طبقاتی سماج کے خواب دیکھنے لگے۔ لوگ خوش تھے کہ جاگیرداری نظام جلد ختم ہوگا اور ڈیرہ غازی خان کے غریب کاشت کار غلامانہ زندگی سے نجات پائیں گے۔ لیکن اب جو کچھ ہوا اُس نے غریبوں کی امیدوں کو ریت کی دیوار ثابت کیا، اور عوامی نمائندوں کی حکومت میں عوام پر جو مظالم ہورہے ہیں۔ ان کا سرسری جائزہ ہی کافی ہے۔ سب سے پہلے علاقہ روجہان میں ایک زمیندار، اُس کے غنڈے اور پولیس مزارعین کو جبراً بے دخل کرنے غریبوں کی اراضی میں گھس گئے اور زبردستی ٹریکٹر کی ٹرالی میں گندم کی بالیاں بھرنا شروع کردیں جس پر غریب کاشت کاروں نے التجا کی کہ وہ ایسا نہ کریں لیکن جاگیردار کے غنڈوں نے مزارعین پر تشدد شروع کردیا جس پر مزارعین نے مداخلت کی تو پولیس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی جس کے نتیجہ میں ایک غریب مزارع گولی لگنے سے موقع پر ہلاک اور اس کا ساتھی بُری طرح زخمی ہوا۔ پولیس مقتول کو ٹریکٹر کی ٹرالی میں ڈال کرلے گئی۔ گویا یہ سب کچھ انسانوں کے سروں کی فصل اٹھانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ اِس واقعہ کے بعد پولیس افسر نے زخمی مزارع کو جو فریاد لے کر گیا تھا یہ کہا کہ اب بھی سر اٹھاؤ گے لیکن زخمی مزارع خوشامد کرنے کی بجائے دل میں ساتھی کی موت کا درد اور آنکھوں میں انتقام کی آگ کے شعلے لے کر لوٹا جو کبھی بھڑک کر ظالموں کے دامن کو جلادیں گے۔

ایک اطلاع کے مطابق پولیس کے اس کھلم کھلا ظلم کو زمیندار اور مزارع کے درمیان بلوہ قرار دیا اور آپس کے جھگڑے کا رنگ دے کر یہ چھپانے کی کوشش کی گئی کہ قاتل کون ہے کس نے قتل کیا ہے اور گولی چلانے والے پولیس مین کو تو کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ وہ وردی پہن کر مجسم قانون ہوتا ہے، اور قانون کے خلاف بات کرنا جرم ہے۔ ضلع ڈیرہ غازی خان میں جاگیردار اور نوکر شاہی کیا کیا جرم کررہے ہیں اور کن کن جرائم کی پشت پناہی کررہے ہیں۔

اگر اس کی تفصیل لکھی جائے تو خاصی طویل ہوجائے گی۔ اس کا اجمالی ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ علاقہ بنگانی تحصیل تونسہ شریف میں پیپلز پارٹی کے کارکن غلام فرید کو ایس۔ ایچ۔ او نے بیگار لینے کے لئے طلب کیا لیکن پارٹی کے کارکن نے یہ کہہ کر پولیس کی بیگار کرنے سے صاف انکار کردیا کہ اب تو عوامی حکومت ہے۔ اب عوام پولیس کی بیگار نہیں کریں گے۔ اس پر تھانے دار نے غلام فرید کو اتنا زدوکوب کیا کہ وہ شدید زخمی ہوگیا اور درد کی شدت کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہوگیا۔ اس جاگیردارانہ نظام میں قریب کوئی ہسپتال بھی نہیں تھا۔ زخمی کو ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال لایا گیا۔ وہ مہینوں چارپائی پر تنہا تڑپتا رہا اور زخمی حالت میں ہسپتال چھوڑ کر چلا گیا۔ تھانیدار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

۲۔ علاقہ دراصہ میں ایک مفلوک الحال کاشت کار کو جبراً بے دخل کرنے کے لئے جیل بھیج دیا گیا جب وہ ضمانت پر آیا تو پٹواری اور زمیندار کی ملی بھگت سے خسرہ گرداوری میں تبدیلی ہوچکی تھی۔ کاشت کار فریاد لے کر اپنی پیشی بھگتنے کے لئے عدالت آیا ہوا تھا کہ اُس کی بیوی کو گھاس چرانے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

۳۔ تھانہ جام پور علاقہ ریخ باغ والا میں زمیندار کے اشارے پر درخت کاٹنے کے الزام میں مزارعین کو گرفتار کرلیا گیا۔ مزارعین ضمانت پر آئے لیکن آتے ہی ایک اور درخت کاٹنے کے الزام میں گرفتار کرلئے گئے۔

۴:۔ تھانہ داجل میں جاگیردار فاروق گورچانی نے ایک غریب مزارعہ جمعہ خان کو جبراً بیدخل کرنے کے لئے اس پر بے حد تشدد کیا اور مزارع کی عدم موجودگی میں اس کی جھونپڑی کو آگ لگادی اور مزارع کے بیٹے کو بیل چرانے کے جھوٹے مقدمہ میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا۔ مزارعہ بے دخل ہوا اس کا بیٹا جیل چلا گیا۔ جھونپڑی جل کر راکھ ہوگئی اور جاگیردار عیش و نشاط کی زندگی گزار رہا ہے۔ پولیس نے جاگیرداری کا تحفظ کرکے گویا امن بحال کردیا۔

۵:۔ یہ واقعہ بہت سے واقعات مل کر ایک واقعہ بنتا ہے۔ اس واقعہ میں ضلعی نائب صدر پیپلز پارٹی اور بہت سے عہدے دار گرفتار ہوئے۔ تھانہ چوٹی جو یہاں کے سب سے بڑے جاگیردار خاندان لغاری کے زیر اثر ہے۔ علاقہ ملانہ کے ایک جاگیردار محمد حسین ملانہ نے ایک غریب مزارع کو جبراً بے دخل کرنا چاہا اور اسے زدوکوب کیا۔ اتفاق سے پیپلز پارٹی کے دیہاتی کارکن موقع پر موجود تھے اور ان کی موجودگی کی وجہ سے جاگیردار موصوف غریب مزارع کو اراضی سے بیدخل تو نہ کرسکا البتہ پولیس کے ساتھ ساز باز کرکے علاقہ کے پیپلز پارٹی کے صدر خیر محمد کو رات کی تاریکی میں اُس کے گھر سے گرفتار کرلیا بچے اور مائیں روتی رہیں۔ پولیس نے عورتوں کی بے حرمتی کی۔ تھانہ چوٹی میں خیر محمد پر ساری رات



تشدد کیا گیا۔ صبح سویرے پارٹی کے کارکن تھانہ کے باہر جمع ہو گئے اور تھانے دار سے مطالبہ کیا کہ وہ خیر محمد پر تشدد کرنے کی بجائے اُسے عدالت میں پیش کرے لیکن تھانیدار نے مزید ۱۲ غریب افراد کو گرفتار کر لیا۔ تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ضلعی دفتر ڈیرہ غازی خان سے پارٹی کے نائب صدر حمید اصغر شاہین کو روانہ کیا گیا لیکن جب حمید اصغر شاہین واپس آئے تو پولیس کی بھاری جمعیت نے شاہین کو دفتر سے گرفتار کر لیا۔ اس طرح مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کے غریب بائیس ۲۲ مخلص کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا اور تین سو افراد کے خلاف مختلف مقدمات درج کئے جا چکے ہیں۔ جن میں سے کچھ کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو چکی ہے۔ باقی ضمانت کرانے کی فکر میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور پولیس کی گرم گرم ہتھکڑیاں ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

پولیس نے جاگیرداروں کی شہ پر گرفتار کئے جانیوالوں کے خلاف لوٹ مار قتل وغارت گری کے جھوٹے مقدمات قائم کر دیتے ہیں۔ بہت سے کارکن ابھی تک ڈیڑھ ماہ سے جیل کی تاریک اور تنگ کوٹھڑیوں میں بند پڑے ہیں اور ان پر طرح طرح کے انسانیت سوز مظالم کئے جا رہے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو پیشاب پیش کیا جاتا ہے۔ حمید اصغر شاہین نائب صدر پیپلز پارٹی کو ایک خاص اور جدید چھوٹی مشین سے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے شاہین کی بائیں آنکھ کی بینائی جاتی رہی اور بائیں کان سے سنائی دینا بند ہو گیا۔ قیدیوں پر وہ وہ مظالم ڈھائے گئے جنہیں سن کر لفظ کی دھجیاں بکھر جائیں۔ شاہین ایک ماہ جیل میں رہنے کے بعد ضمانت پر آ گئے ہیں۔ بجانے پھر کب گرفتار ہو جائیں کیونکہ اس سے پہلے کئی بار ضمانت ہوئی لیکن عدالت سے باہر نکلتے ہی پولیس دوبارہ گرفتار کر لیتی تھی۔

اب پولیس شاہین کو یہ دھمکی دے رہی ہے کہ وہ یہ ضلع چھوڑ جائے۔ ایک طرف پولیس یہ کہتی ہے کہ مزارعہ جاگیرداروں کو بٹائی نہیں دے رہے تھے، اس لئے امن و امان قائم رکھنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ حالانکہ بٹائی تو کیا ابھی گندم کی کٹائی بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ غریبوں کی پٹائی شروع کر دی۔ پھر پولیس نے اپنی صفائی دینے کے لئے یہ پروپیگنڈہ چھوڑا کہ دراصل پیپلز پارٹی کے مرکزی عہدے داروں کے حکم پر پولیس نے انقلاب پسند غنڈہ عناصر کو کچلنے کی مہم چلائی گئی ہے اب پورے ضلع میں پولیس اور جاگیرداروں کا مشترکہ قانون "ڈنڈا" رائج ہو چکا ہے۔ عوام کا کہنا ہے کہ یہاں جاگیردارانہ ظالمانہ، غلامانہ نظام کی بدولت پیپلز پارٹی کو کوئی صوبائی یا قومی نشست حاصل نہیں ہوئی اور یہی وہ ضلع ہے جہاں سے جماعت اسلامی کو ایک صوبائی اور ایک قومی سیٹ جاگیرداروں کے بل بوتے پر حاصل ہوئی ہے اور شاید مرکزی پیپلز پارٹی ضلع ڈیرہ غازی خان کے غریب پارٹی اراکین کو حقارت سے دیکھتے ہیں بہرحال پولیس نے پورے ضلع میں اپنے تشدد سے دہشت پھیلا دی ہے۔ عوام میں خوف وہراس اور بے چینی پائی جاتی ہے۔

اُدھر ریڈیو پر عوام کی خوش حالی کے ترانے سنائے جاتے ہیں تو اُدھر اس ضلع میں غریب کاشت کاروں کے تشدد کی وجہ سے چیخ و پکار ان کے بیوی بچوں کی آہیں اور سسکیاں ریڈیو پر نشر ہونے والے مزدوروں کے ترانوں تلے دب کر رہ گئی ہیں اور جاگیرداروں نے پہلے سے کہیں زیادہ مظالم ڈھانا شروع کر دیئے ہیں۔ عوام پوچھتے ہیں کہ کیا پولیس کی تنخواہیں اسی لئے بڑھائی گئی ہیں کہ وہ غریبوں پر تشدد تیز سے تیز تر کر دیں اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے یہ کہا جائے کہ وہ پارٹی چھوڑ دیں۔ کیا غریبوں کی بجائے ضلع کے بڑے بڑے جاگیردار پارٹی میں شامل ہو کر اپنا تحفظ چاہتے ہیں مجموعی طور پر اصلاحات کے سبب چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان نفرت پائی جاتی ہے۔ جبکہ بڑے بڑے جاگیرداروں کو نوکر شاہی کا پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔

تحصیل راجن پور میں ایک شمانوں کی بیوی جاگیردار کی شہ پر اُس کے سسر نے زبردستی اغوا کر لیا۔ مسمی شانوں فریاد لے کر تھانہ گیا تو جاگیردار موصوف جو کہ علاقہ کا سب سے بڑا رسہ گیر مشہور ہے وہ بھی تھانے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ تھانیدار نے فریادی کو کہا کہ وہ سردار رسول بخش ریشیک سے کام کرائے جاگیردار ہی تمہاری بیوی کو برآمد کرا دے گا۔ لہٰذا فریادی نے اُسی جاگیردار سے التماس کی تو جاگیردار رسول بخش نے ایک شخص کے نام رقعہ لکھ دیا اور کہا کہ فلاں شخص کے پاس چلا جائے۔ ان پڑھ دیہاتی رقعہ لے کر روانہ ہو گیا۔ جب اُس نے رقعہ پڑھوایا تو اس میں صاف لکھا تھا کہ رقعہ حامل ہذا کو پہنچتے ہی پانچ جوتے مار دیں۔ تاکید ہے۔ رقعہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی الفتح میں پیش کی جا رہی ہے۔ پولیس اور جاگیرداروں کے مظالم نے ظاہر کر دیا ہے کہ عوام نے نہیں بلکہ نوکر شاہی اور جاگیرداروں نے عوام کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے اور اس طرح جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے جلاؤ گھیراؤ کی تحریک ضلع ہذا میں چلا رکھی ہے۔ اور یہ پروپیگنڈہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ مزدور گھیراؤ جلاؤ کرتے ہیں اور مزدور ملک دشمن ہیں اب ثابت ہو گیا ہے کہ جاگیردار، سرمایہ دار، نوکر شاہی خود گھیراؤ جلاؤ کرا رہی ہے اور خود جلاؤ گھیراؤ کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کر رہے ہیں۔ کسی زمانے میں مزدوروں نے ملوں کا گھیراؤ کیا تھا۔ کہتے ہیں ملوں، کارخانوں کا گھیراؤ کر کے مزدوروں نے پیداوار میں اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن ضلع ڈیرہ غازی خان میں جاگیردار غریبوں کو بیدخل کر کے بیروزگاری میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اب ضلع ڈیرہ غازی خان کے غریب کاشت کار یہ سوچ رہے ہیں کہ آیا پیپلز پارٹی چھوڑ کر کسی اور پارٹی میں شمولیت کی جائے۔ لیکن کوئی پارٹی ایسی ہے ہی نہیں جو غریبوں کے مسائل حل کر سکے اور انہیں دکھوں سے نجات دلا سکے۔ ان کی نظر میں تمام پارٹیاں ایک سی ہیں۔ کچھ دیہاتی سوچ رہے ہیں کہ پنچایتی سسٹم شروع کیا جائے اور غریبوں کے آپس کے جھگڑے خود پنچایت میں طے کریں۔ تاکہ پولیس اور رشوت وغیرہ سے چھٹکارا مل سکے اور مل کر خود حقوق کا تحفظ کریں، اور ہر ظالم کا متحد ہو کر مقابلہ کر سکیں۔

بقیہ : احوال واقعی

ہے۔ ماؤزے تنگ نے کہا ہے کہ۔

"جب دشمن تمہاری تعریف کرے تو سمجھ لو کہ تم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔"

روزنامہ 'جسارت' اور صدر بھٹو کے بقول سنٹو کے پیسے سے قائم ہوئی۔ پی پی آئی کے ہفت روزہ پیمان نے صدر بھٹو کی اس تقریر کی تعریف کی ہے۔ کیوں نہ کریں کہ صدر بھٹو نے برملا کہا کہ ہم پی ایل ۴۸۰ کے تحت امریکہ سے امداد لے رہے ہیں اور ہم ہی امریکہ کا پرچم جلانے کے لئے جا رہے ہیں۔ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ پی ایل ۴۸۰ کے تحت بھیک مانگنے کے لئے عوام نے کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ عوام کبھی غیر ممالک سے خیرات مانگنے کے حق میں نہیں رہے۔ اس لئے ان کو امداد بند ہونے کا خوف دلانا بالکل غلط ہے ——— پھر ویت نام کے عوام کی جدوجہد جائز ہے۔ جائز جدوجہد کی حمایت بہرحال برحق ہے اگر صدر بھٹو کے بقول پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر پیرس، سکو، لندن میں مظاہرے نہیں ہوئے تو ہم صدر بھٹو سے پوچھتے ہیں اس میں ہنوئی کا کیا قصور ہے۔ چین نے تو ایک ایک قدم پر پاکستان کا ساتھ دیا۔ چین ویت نام کے ساتھ ہے اس لئے پاکستان کے عوام ویت نام کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس میں صدر بھٹو کے برہم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا ہم صدر بھٹو کو پروٹوکول کے انتہائی ابتدائی آداب بتائیں کہ ایک مملکت خواہ ہے وہ سب سے بڑی طاقت ہی کیوں نہ ہو کے ایک قونصل خانے کا پرچم اتارنے پر ——— اگر زیادہ سے زیادہ کوئی شخصیت دخل دے بھی سکتی ہے تو وہ اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر دے دے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ گورنر یا وزیر اعلیٰ ——— ایک ملک کے سربراہ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اتنے معمولی سے واقعہ پر یوں

ردِ عمل دیتا پھرے۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک کا صدر۔ اس عظیم طاقت سے اتنا خائف ہے کہ کہیں وہ اس حرکت پر ناراض ہو گئی تو جانے کیا ہو جائے۔ جب ملک کا صدر اتنے معمولی سے واقعہ پر مظاہرین کو سخت سُست کہے گا تو آئندہ پولیس کا رویہ تو اور زیادہ شدید ہو جائے گا۔ اب کے تو اس نے دانش وروں، ادیبوں کو صرف زخمی کیا ہے! اگلی بار تو وہ گولی چلا کے ایسے ناعاقبت اندیش اور پی ایل ۴۸۰ کے تحت بھیک دینے والی عظیم طاقت کے حق میں گستاخی کرنے والے دانش وروں، ادیبوں کا وجود ہی مٹا دے گا۔ کل انہی مظاہرین کے کندھے پر چڑھ کر صدر بھٹو ایوان صدر میں پہنچے تھے۔ اب وہ پولیس کے ذریعے مظاہرین سے تصادم کروا کے دوسرے لیڈروں کو موقعہ دیں گے کہ وہ مظاہرین کے کندھوں پر بیٹھ کر ایوان اقتدار تک پہنچیں لیکن اب کے مظاہرین اپنا کندھا کسی کو استعمال نہیں کرنے دیں گے۔

بقیہ : داؤد فاؤنڈیشن

کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ ہی قواعد و ضوابط کے مطابق گورننگ باڈی کو فنڈ استعمال کرنے کا اختیار دیا۔ وہ اپنی مرضی سے رقم استعمال کرتے ہیں۔ کالج کی ترقی، طلباء کی پریشانی اور اساتذہ کی مشکلات کا کبھی خیال نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۶۶ء میں طلباء کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ ایک سال میں تین بار ہڑتال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حکومت نے طلباء کی بےچینی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ عثمانی کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی —— تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں حکومت سے اپیل کی کہ نازک صورتحال کے پیش نظر داؤد کالج کو سرکاری تحویل میں لے لیا جائے اور داؤد سے باز پرس کی جائے کہ انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق کالج کی تعمیر اور مستقل اخراجات پر رقم کیوں خرچ نہیں کی۔؟

جنوری ۶۷ ۱۹ء میں گورنر مغربی پاکستان نے کالج کا دورہ کیا۔ ۸ر جنوری ۱۹۶۷ء کو کالج کے طلباء نے ایک تحریری درخواست میں گورنر سے اپیل کی کہ داؤد فاؤنڈیشن میں اعلیٰ پیمانے کی دھاندلی۔ خرد برد، غبن اور لوٹ کھسوٹ کی تحقیقات کرائی جائے اور ٹرسٹ کو داؤد خاندان سے نجات دلائی جائے۔

دریں اثناء طلباء نے صدر اور وزیر مالیات سے بھی ملاقات کر کے داؤد خاندان کی دھاندلیوں کی شکایت کی۔ مگر طلباء کی ان تمام تحریری شکایتوں اور درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ایوب خان اور داؤد کے درمیان دوستانہ مراسم اور طبقاتی سوچ ان جائز مطالبات کی راہ میں دیوار بن گئی۔

داؤد کالج کے طلباء نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

دریں اثناء ایوب دور ختم ہوا اور یحییٰ دور شروع ہوا۔ طلباء نے ایک بار پھر کالج کے حالات سدھارنے کی کوشش کی۔ مگر اس بار اقتدار میں آنے والی حکومت سرمایہ داروں کو خوش رکھنے کی پالیسی میں اپنی پچھلی حکومتوں سے بازی لے گئی۔ یحییٰ خان کا دورِ حکومت داؤد خاندان کے لئے کورا چیک تھا۔ مسٹر احمد داؤد نے پہلے سے کہیں کھُل کر کالج کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہاتھ پکڑنے والا کوئی ہوتا تو کسی قسم کی جھجک محسوس کرتے، یہاں تو سیاں کوتوال بن بیٹھا تھا۔

داؤد انجنیئرنگ کالج آج بھی داؤد خاندان کے شکنجے میں جکڑا ہوا کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ اس کالج کے زیرِ تعلیم طلباء اور تعلیم دینے والے اساتذہ دونوں ایک اجارہ دار سرمایہ دار کے ہاتھوں اس قدر بے بس اور مجبور ہیں کہ داؤد خاندان کے خلاف آواز بھی بلند نہیں کر سکتے۔ اور اگر کبھی اس کی جرأت کر بھی لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ ہمیشہ صفر ہی نکلتا ہے۔

بقیہ : مزدور کسان کانفرنس

میں شامل ہو گئے ہیں۔ ولی خان کے گھریلو ملازموں میں صرف سبحان، ولی خان کے ساتھ ہے لیکن سبحان کا بیٹا جو ولی خان کے گھر کام کرتا ہے مزدور کسان پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ولی خان کے گھر پر مزدور کسان پارٹی کا سُرخ جھنڈا لہرائے گا۔

۳۰ر اپریل ۱۹۷۲ء - پہلا اجلاس

ٹھیک ۹ بجے صبح صدر مزدور کسان پارٹی جناب میجر اسحٰق کی صدارت میں اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ تمام علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین نے بحث میں زبردست حصہ لیا۔ تمام ساتھی اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر تنقید کرتے ہوئے آئندہ لائحۂ عمل کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

رپورٹوں پر بحث مباحثہ کے بعد صاحب صدر جناب اسحٰق محمد نے اپنی تحریری رپورٹ پیش کی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ پاکستان کے متعلق تھا۔ دوسرا حصہ خصوصاً مغربی پاکستان کے بارے میں تھا اور تیسرا حصہ پنجاب کے متعلق تھا (رپورٹ آئندہ پیش کی جائے گی) میجر صاحب کی رپورٹ کے بعد اجلاس کو ایک گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیا گیا تاکہ تمام مندوبین کھانے کے وقفہ میں صدر کی رپورٹ پر غور و خوض کر سکیں۔

دوسرا اجلاس

۳ بجے دن دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس میں سرحد اور سندھ کے دوست بطور مبصرین کے شامل تھے۔ اجلاس کی کارروائی پنجاب مزدور کسان پارٹی کے سیکرٹری جنرل جناب سبط الحسن ضیغم تحریر کر رہے تھے۔ صدارت کے فرائض بدستور میجر اسحٰق صاحب نے ہی ادا کیے۔ اجلاس کا شروع ہونا تھا کہ پارٹی کے ساتھیوں نے پورے جوش و خروش سے بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔ میجر صاحب کی رپورٹ کی توثیق کی گئی اس کے بعد پنجاب مزدور کسان پارٹی کے انتخابات عمل میں آئے۔ اور مندرجہ ذیل عہدے دار منتخب ہوئے۔

صدر جناب اسحٰق محمد (لائل پور) ایڈیشنل صدر جناب اشفاق مرزا (ملتان) سیکرٹری جنرل سبط الحسن ضیغم (گوجرانوالہ) جوائنٹ سیکرٹری امتیاز عالم (بہاولپور ڈویژن)

اس کے علاوہ ہر ضلع سے ایک نائب صدر اور ایک ضلعی سیکرٹری چُنا گیا۔ اس کے علاوہ ۵۳ ممبران پر مشتمل ورکنگ کمیٹی تشکیل دی گئی۔

بقیہ : پیپلز پارٹی کی تنظیم اور کارکن

پارٹی کو صحیح معنوں میں ایک عوامی پارٹی ثابت کر کے دکھانا ہے تو پارٹی کے ڈھانچہ کو جمہوری بنیادوں پر منظم کرنا ہو گا۔ استحصالی طبقات کے نمائندوں کی پارٹی میں شمولیت قطعی بند ہونی چاہئیے۔ ہمیں پارٹی منشور کے مطابق کارخانوں، بنکوں، انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا ہو گا۔ جاگیرداری نظام کو مکمل طور پر ختم کرنا ہو گا۔ ورنہ ہماری پارٹی بھی کنونشن مسلم لیگ کے حشر سے نہ بچ سکے گی۔

بقیہ : اداریہ

حد تو یہ ہے کہ ان وزراء کرام نے صدر بھٹو کی خواہشات کے منافی اپنے ہی دوستوں کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ صحیح صورتِ حال سے صدر کو مطلع کرنے میں مصلحت سے کام لے رہے ہیں اور ان کی کارکردگی کا انداز ایوب خان کے وزراء سے دو قدم آگے ہے۔ ہم یہ اس لئے لکھ رہے ہیں کہ صدر بھٹو اپنے وزراء پر واضح کریں کہ میں ایوب خان نہیں لہٰذا تم کرمانی مت بنو۔

صبح ۷ بجے کی ایکسپریس سے

نیویارک

کا سفر کیجئے

اور دوران سفر ہماری پانچ ہزار سالہ
مہمان نوازی کا لطف اٹھائیے

نیویارک کے لئے پی آئی اے کی پروازیں کراچی سے ہر بدھ - جمعہ اور ہفتہ کو صبح ۷ بجے روانہ ہوتی ہیں -

بدھ
کراچی - تہران - بیروت - جنیوا - لندن - نیویارک

جمعہ
کراچی - دہران - کویت - دمشق - فرینکفرٹ - لندن - نیویارک

ہفتہ
کراچی - قاہرہ - روم - پیرس - لندن - نیویارک

مزید تفصیلات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی بھی پی آئی اے آفس سے رابطہ قائم کریں

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ائیرلائنز

IAL-IPP-2/72

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
1ST JUNE – 8. JUNE 1972